نقیبِ ختمِ نبوۃ ملتان

اشاعتِ خصوصی
بیادِ امیرِ شریعتؒ

احرارِ جگردار

"یہ احرار رضا کار مجھے اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیارے اور عزیز ہیں۔ نخلِ احرار کو سایہ دار بنانے کے لئے بیسیوں سینکڑوں نوجوانوں نے اپنا خون دیا، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، سینوں پر گولیاں کھائیں، تختہ دار پر لٹک گئے، خود باطل سے ٹکرا گئے۔ دریاؤں میں کود گئے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر احرار کا سُرخ ہلالی پرچم لہرا گئے۔ وہ شیروں کی طرح جبر و تشدد کے طوفانوں اور سیلابوں میں دیوِ استبداد کے مقابلے میں سینہ سپر رہے۔ وہ بیڑیوں اور زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ اور جھنکار پر رقص کرتے رہے، انہیں کوئی مصیبت، کوئی مشکل، کوئی لالچ جماعت کے دامن سے الگ نہ کر سکا، انہوں نے بھوکا رہ کر بھی جماعت کو زندہ رکھا، مصائب و آلام برداشت کئے اور جماعت کے اعلان پر بڑی سے بڑی جبروتی و قہرمانی طاقت سے ٹکرا گئے، ان کی سرخ وردی خونِ شہادت کی آئینہ دار ہے، میں ان لوگوں کو کیسے فراموش کر دوں، میں ان کا ساتھ کیسے چھوڑ دوں، میں ان ننگے بھوکوں سے کیسے منہ موڑ لوں، یہی تو میری متاعِ عزیز ہیں۔ یہی وہ ہیں جو کسی لالچ کے بغیر صرف جذبۂ ایمان کے تحت میرا ساتھ دیتے رہے ہیں، آزادی کے طویل سفر میں اگر کسی سے میں نے خدا کے بعد اپنی امیدوں کو وابستہ کیا تو وہ یہی عاشقانِ حق و صداقت تھے۔"

" امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری"
رحمۃ اللہ علیہ

"مجلس کا قیام و بقا بہر حال ایک شرعی امر ہے
تبلیغِ اعتقادِ صحیحہ اور تنقیدِ رسوماتِ قبیحہ، اعلائے کلمۃ الحق، اعلان و بیانِ ختمِ نبوّت و اظہارِ فضائلِ صحابہ و اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین مجلس کے فرائض میں سے ہیں۔ خصوصاً اس دورِ لادینی میں جنسِ انسانی کی تمام مشکلات کے لئے شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ہی بطور حل پیش کرنا ہمارا وہ فریضہ ہے کہ اگر ہمیں دار و رسن تک بھی رسائی ہو جائے تو الحمد للہ۔ اس لئے مجلس کے قیام و بقاء کی بہر حال کوشش رہنی چاہیئے۔"

بانیٔ احرار مؤسسِ تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوّت
امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قدس سرہ

۲۴/ دسمبر ۱۹۴۷ء
خان گڑھ

قولِ فیصل

مجلسِ احرارِ اسلام کے صدر ماسٹر تاج الدین انصاریؒ کے نام حضرت امیرِ شریعتؒ کا اہم تاریخی مکتوب جس کی بنیاد پر جماعت کی آئندہ پالیسی طے کی گئی ہے!

یکے از مطبوعات تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوۃ [شعبۂ تبلیغ] عالمی مجلسِ احرارِ اسلام پاکستان

فرزندانِ وادیٔ پنجند، انسائیکلوپیڈیا پنجاب اور انسائیکلوپیڈیا آف پنجاب پولیس کے مصنف کے قلم سے

ایک اور شاہکار

انسائیکلوپیڈیا آف رحیم یار خان

کون کیا ہے؟

بہت جلد منظرِ عام پر آ رہی ہے!

جس میں سرکاری افسران، عوامی نمائندے، سیاسی و سماجی رہنما، کارکن، صحافی، بنک آفیسران، شعراء، علماء، تاجر، فنکار، طالب علم، ماہر تعلیمات، گورنمنٹ کنٹریکٹرز، صنعتکار، وکلاء، ڈاکٹرز اور معاشرہ کے دیگر تمام نمائندہ اصحاب کے شب و روز کا احاطہ کیا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں تمام محکموں کی کارکردگی اور ضلع رحیم یار خان کے بارے میں نایاب و تاریخی مضامین بھی کتاب میں شامل ہوں گے۔

اچھی کارکردگی کے حامل افراد کو خراجِ تحسین!

اور بدکردار عناصر پر تنقید شامل ہو گی یہ ضخیم کتاب ایک نادر تحفہ سے کم نہ ہو گی۔ کتاب کا ہر لفظ سچائی اور حقائق سے مزین ہو گا۔

انٹرویوز اور تصاویر کا سلسلہ جاری ہے۔ ہمارے نمائندے عنقریب آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ مشتہرین حضرات کیلئے سنہری موقع

حقائق کے انکشاف میں آپ کے تعاون کے متمنی

عبدالحمید بھٹی پریس رپورٹر

بھٹی پبلیکیشنز پوسٹ بکس ۱۵۷، رحیم یار خان

نقیب ختم نبوۃ

اگست ۱۹۸۸ء

سلسلۂ اشاعت ۷

رفقائے فکر

سیّد عطاء المحسن بخاری
سیّد عطاء المؤمن بخاری
سیّد عطاء المہیمن بخاری
سیّد محمد کفیل بخاری
سیّد عبد الکبیر بخاری
سیّد محمد ذوالکفل بخاری
سیّد محمد ارشد بخاری
سیّد خالد مسعود گیلانی

عبداللطیف خالد ○ اختر جنجوا
عمر فاروق عمر ○ محمود شاھد
قمر الحسنین ○ بدر منیر احرار

رابطہ : مدرسۂ معمورہ
دارِ بنی ھاشم، مہربان کالونی ملتان

قیمت: ۳/- روپے ◎ سالانہ ۳۵/- روپے
اس شمارہ کی قیمت 6/- روپے

دل کی بات

لعنۃ اللہ علی الکاذبین

مرزائیوں کا موجودہ مدار المہام مرزا طاہر لعنۃ اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واعوانہٖ وانصارہٖ گزشتہ چار برس سے اپنے حقیقی آقایانِ ولی نعمت فرنگی کی آغوش میں پناہ گزین ہے اور فرار و بزدلی کی زندگی گزار رہا ہے۔

لندن میں اپنے "مرزواڑہ" میں بیٹھ کر یہ دیا کھیان دیا ہے کہ "دنیا بھر کے معاندین و مکذبین اور مکفرین اس سے مباہلہ کر لیں تو حق و باطل کا آسمانی فیصلہ ظاہر ہو گا۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس بیان کا مقصد اپنی گری ہوئی ساکھ بحال کرنے اور سستی شہرت حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

نشۂ عشقِ محمد سے سرشار کچھ دیوانوں نے مرزا طاہر علیہ ما علیہ کے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے لسے اپنے اہل و عیال سمیت میدان میں آنے کی دعوت دی اور سرِ عام للکارا لیکن ضرب المثل مشہور رہے کہ "جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اور گدھے کے سر پر سینگ نہیں ہوتے" یہ مثال مرزائیوں کے اس چیلنج پر صادق آتی ہے کہ فوراً راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے پاکستان کے تل ابیب "ربوہ" سے ٹُنگی ڈاڑھی منقی چہرے کے حامل مرزائیوں کے نمائندے نے یہ بھاشن دیا کہ مباہلہ کے لئے کسی مقام اور تاریخ کے تعین کی ضرورت نہیں لہذا تمام معاندین مرزائی پارٹی کے لئے بد دعا کریں اور ایک سال انتظار کریں پھر آسمانی فیصلہ کا ظہور ہو گا۔ حالانکہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ

لعنۃ اللہ علی الکاذبین

حقیقت یہ ہے کہ مرزائیوں کو ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی میں اپنی صفائی دینے

کا موقع فراہم کیا گیا اور آنجہانی مرزا ناصر حق پرست علماء کے سامنے ایل بی ڈبلیو ہو گیا۔

مرزائی پوری امتِ مسلمہ کے فیصلہ کے مطابق کافر و مرتد ہیں اور پاکستان میں اس فیصلہ کو آئینی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے ان سے مباہلہ کرنا حق اور سچائی کو چند کذابوں اور قذاقوں کے سامنے دلیل کا محتاج بنانے کے مترادف ہے۔ اس سے بڑھ کر آسمانی فیصلہ کا اور کیا ظہور ہوگا کہ مرزائی اسلام کی نعمت اور حضور کی ختم نبوت کی اتباع سے محروم ہیں۔

ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم

مرزائی اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں ہیں اور ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ مجلس احرار اسلام کی برپا کردہ تحریک تحفظِ ختم نبوت سے "مرزے دی بول گئی لکڑوں کوں" والا معاملہ ہو گیا ہے۔ احرار جانباز اس جہاد کو تیز تر کر دیں۔

اب جنگ فیصلہ کن مراحل میں ہے اور عن قریب اللہ کے فیصلہ فجعلھم کعصف مأکول کا ظہور ہونے والا ہے۔

جہادِ احرار کے نتیجہ میں ان دنوں صورتِ حال یہ ہے کہ مرزا طاہر کو لندن میں بھی سکون میسر نہیں دن کو تارے گنتے ہیں رات کو ڈرتے ہیں۔

ڈر سے سوتے ہی نہیں رات کو مرزا صاحب
آنکھ لگتی ہے تو احرار نظر آتے ہیں

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

———— • جامعہ خیر المدارس ملتان کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد شریف کشمیری مدظلہ کے اکلوتے اور مجاہد فرزند حضرت مولانا محمد مسعود کشمیری جہادِ اسلامی افغانستان میں ایک محاذ پر شہید ہو گئے آپ جمعیۃ المجاہدین کے سربراہ تھے اور مسلسل آٹھ برس سے جہاد میں مصروف تھے۔ • مجلس احرار اسلام کے رہنما جناب حافظ اکبر صاحب کے والد ماجد جناب اولیاء خان صاحب وفات پا گئے • سرگودھا میں ہمارے رفیق جناب مولوی محمد طارق صاحب کی معصوم بیٹی ایک حادثہ میں شہید ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ سب کی مغفرت فرمائیں اور درجات بلند فرمائیں آمین۔ مجلس احرار اسلام کے تمام اراکین و معاونین پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ (ادارہ)

بنتِ امیرِ شریعت سیّدہ اُمِّ کفیل بخاری

تری حیات ہے قندیل رہ دکھاتی ہے

اگر مہرِ نیم روز کے سامنے مٹّی کا دِیا جلا کر سورج کی روشنی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے یا شبِ ماہتاب میں شمع جلا کر رات کی تاریکی کم کی جا سکتی ہے یا نسیمِ سحر کے روح پرور اور جاں فزا جھونکوں کے روبرو دستی پنکھے ہواؤں کو رُوح میں اتار سکتے ہیں تو پھر میرے ابّا جی کی شخصیت کا حُسن و وقار الفاظ سے اُجاگر کیا جا سکتا ہے۔ اولاد ہونے کے ناطہ سے ابا جی ہمارے لیے دنیا و آخرت کی سب سے بڑی نعمت تھے۔ اور ہمارے لئے تو ع

پھر اُن کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ان کی زندگی کے تمام نشیب و فراز ہمارے لئے تو اصولِ زیست تھے اور ہیں ۔ اُن کی قدر و منزلت ——— تو ان کو رلصرانیوں، بیگانوں سے پوچھی جائے کہ جنھوں نے ان سے نہ صرف یہ کہ اختلاف کیا بلکہ مخالفت کی پستیوں میں اُترتے چلے گئے۔ الزام و دشنام کا کون سا گوشہ ہے جو مسلمان کہلانے والوں نے کفار و مشرکین کے ہم نوا ہو کر نہ بسایا کہ ہر سو شرافت دم توڑ گئی اور حیا سرنگوں ہو گئی۔

پھر حالات کو اُن کے پیش کردہ خدشات کے مطابق ڈھلتے دیکھا تو یہی غدّار کہنے اور گالیاں دینے والے روتے ہوئے ان کی چوکھٹ پر آئے اور انہوں نے گلے لگاتے ہوئے وہی سلوک کیا جو ایک باپ بے وقوف اولاد کے نادم ہونے پر کرتا ہے۔

جب بھی وہ یاد آتے ہیں تو ذہن میں ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے اور سمجھ نہیں آتا کہ اگر ان یادوں کو قلم بند کروں تو کہاں سے شروع کروں ۔ میرے بچے جب اُن کی باتیں سنتے تو باصرار اُن کی فرمائش ہوتی کہ اپنی یادداشتیں قلم بند کر دیں ۔ مگر پہلے گھر کے کام اور بچوں کی نگہداشت سے

فرصت نہ ملتی ۔ بچیوں نے گھر کا کام سنبھال لیا تو اپنی صحت جواب دے گئی۔ نورالعیون، کفیل احمد اور محمد ذوالکفل سلمہا کا دھیما دھیما اصرار کئی دن سے جاری ہے اور میں عجوزۂ مصر کی طرح سنت کی انٹی لے کر خریداری کا ارادہ اس لئے باندھ رہی ہوں کہ وہ جس کی نگاہِ برق اور چہرہ آفتاب تھا۔ وہ مجھ پہ محبتوں کی بارش برسانے والا میرا باپ تھا۔ محبت صرفی نحوی قواعد سے آزاد ہوتی ہے۔ بس مجھے جو جہاں یاد آتا جائے گا لکھتی رہوں گی۔

مجھے اپنے بچپن کا سب سے پہلا واقعہ جو یاد آتا ہے وہ چار برس کی عمر کا ہے۔ امرتسر میں ہمارا مکان گلوالی دروازہ کے اندر تکیہ بابا ستار شاہ سے ورے اور مولانا بہاؤالحق قاسمی مرحوم کے گھر کے سامنے تھا ہمارے گھر کا دروازہ سڑک پر کھلتا تھا اور گھر کی جنوب مشرقی سمت کی کھڑکیاں بھی سڑک پر کھلتی تھیں۔ محلے کی سڑک تھی شاہراہ نہ تھی ٹریفک کی کمی کی وجہ سے بچے سڑک کے اس پار سے اُس پار آسانی سے آجا سکتے تھے۔

سڑک پر خوانچے والے پے در پے گزرتے اور گزرتے بھی صدائیں لگاتے ہوئے تو کسی وقت ایمان "متزلزل" ہو ہی جاتا!

ایک دن بیر بیچنے والے کی آواز کان پڑی تو میں نے اماں جی سے ایک پیسہ مانگا جو مل گیا اور میں "بانو" کے ہمراہ دروازہ پر پہنچی تو بیر والا پچھواڑے میں "گورکنڈوں" کی گلی میں پہنچ چکا تھا ہم نے اس سے بیر لئے اور گلی میں بانو مجھے اپنے مکان میں لے گئی۔ وہاں کچھ دیر ہوگئی اور ادھر میری تلاش شروع ہوگئی ڈھونڈنے والا یاد نہیں کون تھا بہرحال وہ "بانو" کے مکان تک پہنچ گیا اور ہمیں لے کر گھر آگیا۔ اباجی اس تاخیر پر پریشان تھے۔ انہوں نے اظہارِ ناراضی اور تنبیہ کے لئے ایک ہلکا سا طمانچہ میری گال پر سجا دیا۔ میرے لئے تو گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں جو اونچی آواز سے ڈانٹ سننے کی عادی نہ تھی۔ رخسار پر طمانچہ کھا کے بھوٹ بھوٹ کر روئی اور روتے روتے وہیں اباجی کے پاس ہی سوگئی۔

اس واقعہ کو نصف صدی بیت چکی ہے اور مجھے خوب یاد ہے کہ جس وجہ سے میری آنکھ کھلی وہ یہ تھی کہ میرے اباجی میرے گال اسی جگہ سے چوم رہے تھے جہاں انہوں نے طمانچہ مارا تھا۔

ہمارے گھر میں ۱۹۳۸ء تک (۱۹۳۸ء میں بھائی عطاء المحسن مسلمہٗ کی ولادت ہوئی) میرے

اور بھائی جان کے علاوہ ایک شخصیت اور تھی جو سنِ شعور کو پہنچنے تک ہمارے ہاں بطور فردِ خانہ مقیم رہی اور وہ تھی "بانو" بانو محلّے کے ایک غریب کشمیری خاندان کی لڑکی تھی کسی اُستاد کے قابو نہ آتی تھی۔ اُس کی والدہ امّاں جی کے پاس قرآن پاک پڑھنے کے لئے بٹھا گئی۔ مجھے بانو کی آمد کا سماں آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ہمسایوں کے لڑکے بانو کے ہاتھ پاؤں پکڑے اس کا "ڈول ڈنگا" بنا کر اُٹھائے ہوئے لے آئے اور بانو بھی ہاتھ پاؤں مارتی چلاتی ہوئی اپنا آپ ان ظالموں سے چھڑانے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھی ـــ اور پھر یہ منظر اکثر دیکھنے میں آتا کہ محلے کے ہمسایہ بچوں کی دستی زنجیر میں جکڑی ہوئی بانو تڑپتی پھڑکتی ہمارے ہاں پہنچائی جا رہی ہے۔ آخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یا تو ہم بھائی بہنوں کے ساتھ یوں گھل مل اور رچ بس گئی گویا بانو میری بہن ہے۔ بانو کے اس انقلاب میں میرے ابا جی کے روح میں اتر جانے والے پیار کا بہت زیادہ حصہ تھا اگرچہ اماں جی نے بھی اس سے کم محبت نہیں کی تھی مگر اماں جی اس کی معلّمہ بھی تھیں اس ناطے کبھی کبھار "مرمّت" بھی ہو جاتی لیکن بانو ابا جی کی مؤدت و رأفت سے اس گھر کے ایک فرد کی صورت میں ڈھل گئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ماہ و سال یوں گزر گئے کہ مجھ میں اور بانو میں جدائی کا تصور بھی کبھی نہ ابھرا تھا کہ اچانک بانو کی شادی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا پھر وہ دن بھی آیا کہ بانو شادی کی رسموں کے لئے ماں باپ کے گھر نہیں جاتی بلکہ اس کا اصرار یہ ہے کہ یہ رسمیں بھی ہمارے ہی گھر میں ادا ہوں گی۔ پھر ایسا ہی ہوا ـ کیا ہوا جو بانو مہینے میں کبھی کبھار اپنے ماں باپ کے گھر بھی ہو آئے۔ پھر وہ دن بیٹیوں کی رُخصتی کی تاریخ میں انوکھا دن تھا کہ اُدھر دولہا کی بارات آئی ہوئی ہے ادھر بانو دلہن بنی ہمارے گھر اور ایک ایک کے گلے لگ کے رو رہی ہے اور چیخ کر اماں جی کے گلے میں باہیں ڈالے چلا چلا کر ایک بات کہے جا رہی ہے" بے بے جی اج میں تہانوں کیوں نئیں چنگی لگدی آج مینوں کیوں گھروں کڈن لگے او۔ اج تُسی مینوں کیوں اپنے کول نئیں رکھدے" . . . . . ہمارے گھر میں کہرام بپا ہے۔ ابا جی اور ہم سب اشکبار ہیں روتے روتے ہماری ہچکیاں بندھ گئیں بڑی منتوں اور سماجتوں سے بانو اپنے میکے سے نہیں ہمارے گھر سے، سید عطاء اللہ کی محبتوں کے گہوارے سے سسرال جا رہی تھی۔ یہ اس دَور کی بات ہے جب بیٹیاں میکے چھوڑتے رویا ہی کرتی تھیں۔ ہماری بانو جو اب اس دنیا میں نہیں ہے اس کی محبتوں کا تذکرہ تفصیل چاہتا ہے۔ روحِ وفا، جانِ اخلاص بانو! تیری تربت پہ اللہ کی رحمتوں کا نزول ہو۔

بانو! اے کاش تو اب سن سکے کہ دنیا نے شرم و حیا، اخلاص و وفا، غیرت و حمیت اور محبت و پیار کی وہ تمام روشیں پامال کردی ہیں۔ بانو! وہ چمن اس ظالم و سفاک مغربی تہذیب و معاشرت نے اجاڑ کے رکھ دیا ہے۔ اے کاش! حوا زادیاں شرافت کے وہ رات دن پھر واپس لے آئیں۔

مسوری

ہندوستان میں ایک بہت صحت افزا پہاڑی مقام ہے۔ اماں جی کا بخار ایک دفعہ بگڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے ٹی۔بی کا شک ڈال دیا اور بحالی صحت کے لئے معالجوں کے مشورہ سے چار برس موسم گرما میں اباجی ہمیں وہاں لے جاتے رہے۔ خود پورے ہندوستان میں تبلیغی دورں پر بھی جاتے تھے اور ہمارے پاس بھی کچھ وقت گزار آتے۔ قیام پاکستان کے بعد جب ہم لوگ ترک سکونت کرکے ملتان آئے۔ یہاں ایک بار فرمانے لگے کہ میں نے ساری زندگی میں تمہیں ایک بار طمانچہ مارا تھا۔ مسوری میں تو زمین پر لیٹی ہوئی تھی اٹھتی نہ تھی۔ میں کہہ بیٹھی کہ نہیں اباجی ایک تھپڑ اور بھی ہے اور بیر خرید نے کا قصہ سنایا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ فرمانے لگے مجھے معاف کردو! تم نے اب تک یاد رکھا ہوا ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں جی کبھی بیٹی، جو نہ تھی اس لئے یاد رہ گیا ہے عمداً تو یاد نہیں رکھا! اللہ کی رحمتیں بارش کی طرح ان کے مرقد پر برسیں! مسوری ہی کا ایک اور واقعہ چند دفعہ انہوں نے دہرایا اور ہر بار آبدیدہ ہو جاتے۔ ہوا یوں کہ ایک دن سیر کے لئے نکلے تو مجھے گود میں لیا ہوا تھا۔ ڈھلوان سے نیچے اترتے ہوئے پاؤں پھسل گیا اباجی منہ کے بل گرے مگر مجھے بچانے کی کوشش کی میں گری تو سہی لیکن صرف ان کے ہاتھ کا بوجھ مجھ پر آیا فرماتے تم نے اٹھ کر یہ نہیں کہا کہ مجھے چوٹ لگی بلکہ ماں کو شاگردوں کی پیروی میں کہا! "بیوی جی شاہ جی ڈگ پئے شاہ جی نوں سٹ لگی اے" بیٹی تھیں نا! گھر میں ان کا آنا سب کے لئے خوشی کا باعث ہوتا مگر مجھے تو ایسی ہی خوشی ہوتی تھی جیسی بچپن میں عید کی! وہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہیں آتے تھے۔ اسٹیشن سے گلوالی دروازہ آتے ہوئے ہال بازار سے موسم کا عمدہ پھل خرید کر آتے۔ اچھے سے اچھے کھانے کھلاتے اور یوں بھی ان کے طفیل اللہ کی نعمتیں گھر کا احاطہ کئے رہتیں مگر جو چیزیں ان کے لئے قطعی ناقابل برداشت تھیں۔ ہمارے حق میں بالخصوص اور متعلقین کے لئے بالعموم وہ تھیں جھوٹ اور چوری۔ بڑے سے بڑا نقصان سچ بولنے پر معاف فرما دیتے تھے، سزا نہیں دیتے تھے بلکہ سمجھاتے تھے۔ امرتسر کا مکان مختصر مگر بڑے قرینے کا پختہ بنا ہوا تھا جو اباجی نے اپنے استاد زادے اور ہم سبق حضرت مولانا بہاء الحق قاسمی مرحوم و مغفور سے خریدا تھا

حضرت مفتی غلام مصطفیٰ صاحب قاسمیؒ کے مرید مستریوں نے بڑی عقیدت سے بنایا ہوا تھا۔ مولانا مرحوم نے وہ اباجی کے ہاتھ بیچ دیا اور بالکل سامنے اور بنا لیا۔ ۱۹۴۷ء تک ہم لوگ آمنے سامنے رہے۔ بیٹھک صحن اور دونوں ڈیوڑھیوں میں سیاہ و سفید ٹائلوں کا فرش تھا۔ بچپن میں چینی کا کوئی برتن ہاتھ سے چھوٹ جاتا تو کرچی کرچی ہوجاتا۔ اماں جی ہلکی سی سرزنش کرتیں۔ جب کبھی اماں جی چھت پر ہوتیں اور میں نیچے برتن توڑلیتی تو پھر دل سے بے اختیار اباجی کی آمد کی "پرخلوص" دعائیں نکلتیں کیونکہ سچ بولنے پر ایک تھپڑ بھی نہیں پڑتا تھا صرف احتیاط سے اُٹھانے کا کہتے تھے۔ ویسے بچپن میں مجھ سے برتن ٹوٹے بھی بہت! ایک دن مولانا بہاء الحق صاحب کی ایک لڑکی سے کھیلتے کھیلتے لڑائی ہوگئی۔ وہ بُرا بھلا کہہ کر گھر چلی گئی۔ چھت پر کھیل رہے تھے۔ مجھے اپنے غصہ کے فرو کرنے کی یہ صورت نظر آئی کہ سلیٹی سے دیوار پر اس کا نام لکھ کر آگے کوئی نازیبا لفظ لکھ دیا کچھ دیر بعد اباجی چھت پر گئے اور وہ لفظ انہوں نے لکھا دیکھ لیا۔ نیچے آئے اور مجھے آواز دے کر بیٹھک میں بلایا پاس بٹھا کر آرام سے پوچھا کہ اوپر دیوار پر فلاں لفظ تم نے لکھا ہے؟ مارے ندامت اور خوف کے میرا خون خشک ہونے لگا اور قوتِ گویائی جواب دینے لگی۔ مجھے علم تھا کہ وہ ماریں گے نہیں۔ مگر جب کسی غلطی پر وہ فرماتے بیٹا یہ حرکت تم نے کی؟ تو جی چاہتا زمین پھٹ جائے اور میں روپوش ہوجاؤں۔ محض اُس شرمندگی سے بچنے کے لئے میں نے جھوٹ بولا کہ نہیں جی میں نے نہیں لکھا بچپنے میں اتنا سوچنے کی ہوش کسے تھی کہ وہ تو ماتھے پڑھ لیتے ہیں۔ انہوں نے ماریہ بُرا لفظ کہا دو تین دفعہ وقفے وقفے سے جب پوچھا کہ کیا تم نے نہیں لکھا تو محسوس ہوگیا کہ سچ بولنے کے علاوہ نجات کی کوئی صورت نہیں۔ میں نے مان لیا کہ ہماری لڑائی ہوئی تھی اور میں نے ہی لکھا ہے۔ فرمانے لگے تو جھوٹ کیوں بولا؟ آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولنا جاؤ اور جا کر دیوار سے وہ لفظ مٹا دو۔ یہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اخلاقیات کے سلسلہ میں معمولی باتوں پر بھی نظر رکھتے تھے یہ آٹھ نو برس کی عمر کی بات ہوگی۔ ایک دفعہ وہ بہت دنوں کے لئے دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ میرا دل بہت اداس تھا۔ وہ بہت ٹھنڈا پانی پیتے تھے اور گرمی کے موسم میں گھر میں زیادہ پیاس کے وقت کسی بادیے یا بڑے برتن سے پیتے تھے۔ میں نے وہی برتن اٹھایا اور اس سے اباجی کی طرح ہی منہ لگا کر پانی پیا۔ جب اباجی واپس آئے اور حسب معمول کھانا کھاتے وقت مجھے ساتھ بٹھا لیا تو میں نے کہا اباجی میرا دل آپ کے لئے بہت اداس تھا تو میں نے اس برتن سے ویسے

ہی منہ لگا کر پانی پیا تھا جیسے آپ پیتے ہیں۔" اباجی! ایہہ وی تے اک طراں دی یاد ای اے نا؟" یہ بات ان کے دل کو لگی اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ کرنے دہلی آیا تو دیگر جماعتوں کی طرح احرار کے رہنما بھی مہینہ کے قریب دہلی رہے۔ اباجی سمیت۔ ظاہر ہے میں یاد تو آتی ہوں گی۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم جب دہلی رہتے تھے۔ شیخ (حسام الدین) چچا جان اور اباجی کی انہوں نے دعوت کی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی انگریز بیگم کو سامنے لے آئے۔ انہوں نے بچوں کا پوچھا۔ تفصیل بتانے کے بعد یہ قصہ ڈاکٹر صاحب کو سنایا فرمانے لگے ڈاکٹر متحیر سا ہو گیا دو تین دفعہ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا ارے ارے۔ فرمانے لگے۔ ڈاکٹر کی بیوی پوچھنے لگی کہ بچے کتنے ہیں؟ میں نے کہا چار بیٹے اور ایک بیٹی وہ کہنے لگی آپ لوگ بیٹی کو حقیر سمجھتے ہیں آپ نے یہ نہیں کہا کہ پانچ بچے ہیں بلکہ یوں کہا کہ چار بیٹے اور ایک بیٹی۔ میں نے کہا نہیں بابا یہ بات نہیں مجھے تو بیٹی بیٹوں سے زیادہ پیاری ہے۔ اور حقیقت بھی یوں ہی تھی مگر وہ تو جھاڑ کا کانٹا بن کر چمٹ گئی۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا میرا پیچھا چھڑاؤ وہ مسکرا کر کہنے لگا باپ جانے اور بیٹی! میں تو دخل دیتا نہیں پھر فرمایا کہ ڈاکٹر تاثیر کہتا تھا انگریز عورتوں کو جب کوئی بیٹی کہے تو بہت خوش اور متاثر ہوتی ہیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا میں نے کہا اباجی ہندوستان سے ایسا کون گیا ہے جس نے وہاں بیٹی بنائی ہو؟ جو گیا بیوی ہی بنا کر لایا ظاہر ہے بیٹی کہنے والے سے متاثر تو ہوں گی۔ اور اباجی تو گھر کی جمعدارنیوں تک کو امرتسر، ملتان میں بیٹی ہی کہہ کر بلاتے تھے۔ بچپن سے دیکھتے آئے کہ گھر میں آنے والی خواتین بیعت کے لئے آئیں یا ویسے کسی کام سے عمر کے مطابق اماں، بہن اور بیٹی کہہ کر مخاطب فرماتے۔ امرتسر میں ہماری جمعدارنی مسلمان تھی خیراں نام تھا اماں جی نے اسکو نماز یاد کرائی آدھا سپارہ اس نے پڑھا پھر اپنے کام کی مجبوری میں چھوڑ دیا۔ اس کی بھی ایک ہی بیٹی تھی کبھی کبھی وہ گھر آتی اور ہمارے ساتھ کھیلتی ۴۵ء میں ہم لوگ کشمیر جانے لگے تو وہ کہنے لگی "شاہ جی! حمیدہ کہتی ہے میرے لئے کشمیر سے اخروٹ کی لکڑی کی بنی ہوئی ایک صندوقچی ضرور لائیں جس پر پھول لکڑی کو کھود کر بنائے جاتے ہیں۔" اباجی نے نہ صرف اس فرمائش کو یاد رکھا بلکہ خود جا کر سری نگر کی انارکلی" امیرا کدال" سے ایک خوب صورت صندوقچی خریدی اور امرتسر آکر جمعدارنی کو دی۔ وہ مصائب میں گھبراتے نہیں تھے متوجہ الی اللہ ہو جاتے تھے۔ اپنی تکلیف کی پرواہ نہیں کرتے تھے مگر ہماری تکلیف اُن سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ۴۷ء سے بے خانماں ہو کر ہم لوگ چھ ماہ

لاہور پڑے رہے ۔ کوئی ڈھنگ کا مکان ڈھونڈنا اُن دنوں جوئے شیر لانا تھا۔ گوجرانوالہ کے کوئی عقیدت مند ایک دن آئے اور کہنے لگے۔ ہمارے محلہ میں ایک مکان ہے ۔ اس کا سکھ مالک چابی اُن صاحب کو نائب دے گیا تھا آپ آکر دیکھ لیں ! بادلِ نخواستہ گئے اور دوپہر گوجرانوالہ کاٹ کر واپس لاہور آگئے۔ ہم لوگ اُن دنوں مجلسِ احرارِ اسلام کے ترجمان روزنامہ آزاد کے دفتر کی بالائی منزل پر ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن میں گزارا کر رہے تھے ۔ ایک کمرے میں چودھری افضل حق صاحب مرحوم کے کنبے کا سامان تھا اور چھٹیاں گزارنے جاتے ہوئے وہ لوگ یہ کمرہ ہمیں دے گئے تھے !

اباجی ! گوجرانوالہ سے واپسی پر اوپر تشریف لائے اور اماں جی سے کہنے لگے ۔ استغفر اللہ ! دوپہر کانٹوں پر گزاری ہے میں چارپائی پر لیٹا نیچے نظر پڑی تو اُس سکھ کے پیاز بھی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا میرا ان چیزوں پر کیا حق ہے ؟ ہم لوگ اگست کے اواخر تک دفتر ہی کے کمرے میں پڑے رہے کمرے میں دو چارپائیاں بچھتیں دوپہر کو بھائیوں اور اماں جی نے بھی لیٹنا ہوتا تھا۔ میں دو کرسیاں آمنے سامنے بچھا کر ان پر لیٹ جاتی ۔ آخر نواب زادہ نصر اللہ خاں صاحب نے اباجی کو اپنے ہاں چلنے کی دعوت دی ۔ فی الحقیقت ہمارے لئے اُس وقت یہ پیشکش انتہائی قابلِ قدر تھی۔

نوابزادہ صاحب نے اپنی واحد حقیقی ہمشیر سے اپنا مکان فارغ کروا کر ہمیں دیا اور اپنے مردانہ بنگلہ کا آدھا حصہ ان کو رہائش کے قابل بنا دیا اور ان کے پورے خاندان نے ضروریاتِ زندگی کے جمع کرنے میں ہر طرح سے مدد کی ۔ امرتسر کے ۳۰ - ۳۵ برس سے بستے گھر سے جو سامان لے آئے وہ ایک لحاف، ایک گدا۔ تین چار کھیس ایک بوری برتن مستعمل کپڑوں کے تین چار بکس اور سلائی مشین پر مشتمل تھا۔ یہ بھی اماں جی کی ہمت سے جس دن امرتسر سے نکلے ہیں انہوں نے اباجی سے کہا جہاں بھی جا کر رہیں گے کیا کیا چیز کسی سے مانگیں گے! دفتر میں رہائش کے دنوں میں آغا شورش کاشمیری مرحوم و مغفور اور غازی محمد حسین حنفی سالارِ اعظم جیوش احرارِ اسلام نے بارہا کہا کہ ہم ٹرک لے کر امرتسر جاتے ہیں ۔ رضاکاروں کو ساتھ لے کر آپ کا سامان نکال لاتے ہیں مگر اباجی نے فرمایا نہیں بھائی ! میں یہ نہیں سننا چاہتا کہ عطاء اللہ شاہ نے اپنے سامان کے لئے لوگوں کے نیچے مروا دیئے کیونکہ مسند سکھ جب کسی مسلمان کو اپنے مُنہ سے گزرتا دیکھتے تھے۔ اپنے مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں سے بم گراتے تھے ۔ ہمارے محلہ کے دو لڑکے باقی اور بھائی جان سے ملنے لاہور آنے لگے۔ تانگہ ہال بازار پہنچا تو کسی طرف سے دستی بم گھوڑے پر گرا ۔ پچھلی سیٹ سے

چھلانگیں لگا کر کودے اور پیدل بھاگتے ہوئے اسٹیشن پہنچے۔ خان گڑھ کا قیام شروع میں ہمارے لئے بڑا عجیب تھا۔ رشتہ دار وطن ہمسائے سب چھوٹ گئے تھے۔ کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آتا سوائے اباجی کے اور کسی کو زبان بھی سمجھ نہ آتی۔ کوئی لفظ اماں جی سمجھ لیتیں کہ ملتان بہاول پور سے کبھی کوئی مریدہ عورت ملنے اکثر چلی جاتی تھی۔ آب و ہوا بھی ناموافق رہی۔ ایک سال کے قیام کے دوران اکثر اوقات سب بہن بھائی اور اباجی بخار میں مبتلا رہے اباجی کو کچھ افاقہ ہوا تو بھائی عطاالمحسن شدید بخار میں مبتلا ہو گیا۔ ایک دن اسے سرسام ہو گیا ایسی کیفیت کبھی کسی کی نہ ہوئی تھی اماں جی کے مثالی صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ انہوں نے روتے ہوئے مجھے کہا اپنے اباجی کو بلاؤ میں نے دوڑ کر مردانے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ اباجی نقاہت کی وجہ سے بمشکل چل کر آئے خان گڑھ میں تو ان دنوں معالج نام کی کوئی چیز دستیاب نہ تھی۔ اچھرہ سے اباجی کے رفیقانِ جماعت جناب میاں قمرالدین، میاں محمد رفیق صاحبان مرحوم و مغفور کے ایک عزیز حکیم خالق داد صاحب مرحوم آئے ہوئے تھے ان کو بلایا وہ بے چارے فوراً ہی آ گئے اور ان کی تدبیروں سے گھنٹہ بھر بعد بھائی کو ہوش آیا اور آج بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ جب محسن نے آنکھیں کھولیں تو اباجی اینٹوں کے فرش پر سجدہ میں گر گئے اور روتے ہوئے کہنے لگے مولا! میں اس آزمائش کا متحمل نہیں ہوں!

جس دن ہم لاہور سے خان گڑھ روانہ ہوئے تانگہ میں بھائی جان نے کوئی بات کی وہ تو میں نے نہیں سُنی مگر اباجی کا جواب آج بھی یاد ہے کہ بیٹا کوئی سہارا نہیں سوائے اللہ کے اور لعنت ہے اُس سہارے پر جو ما سوا اللہ کے [illegible] ایک برس [illegible] سے کچھ دن کم ہی رہے۔ جب حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری ملتان تشریف لے آئے اور مدرسہ کا دوبارہ اجراء ہو گیا تو انہوں نے بھائی جان کو بُلوا لیا تھا اور پاکستان بننے کے بعد خیرالمدارس سے جو پہلا گروپ فارغ التحصیل ہوا بھائی جان اُسی میں شامل تھے۔ مگر چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کا کچھ بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔ اباجی اس باب میں متفکر تھے اور ملتان میں اپنے احباب کو مکان کی تلاش کا کہہ رکھا تھا۔

۵ر فروری ۱۹۴۸ء کو ہماری سب سے چھوٹی اور سب کی چہیتی بہن سیدہ سالمہ بانو دو روزہ علالت کے بعد ہمیں داغِ مفارقت دے گئی۔ اباجی اور ہم سب کے لئے غربت میں بڑا شدید صدمہ تھا وہ گھر بھر کی رونق تھی وہ بے چاری علی الصباح فوت ہوئی اس افراتفری کے زمانہ میں ملتان سے خان گڑھ تک ایک ہی لاری سارے دن میں چلتی تھی۔ اباجی نے اپنے ایک غریب بوہار مرید سے کہا کہ لاری پر جا کر ملتان سے حافظ کو لے آؤ وہ اڈے پر آیا تو لاری نکل چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کو بہت بہت اجر و رحمت فرمائیں۔ وہ بے چارا

اپنے سائیکل پر ہی ملتان روانہ ہو گیا اور سوءِ اتفاق کہ جب وہ بھائی جان سمیت روانہ ہوا تو ملتان سے کبھی کوئی لاری نہ ملی اور وہ اللہ کا بندہ پھر سائیکل پر ہی بھائی جان کو لے کر خان گڑھ پہنچا۔ تو رات کے ۹ بج چکے تھے۔ اباجی نے عصر تک انتظار کیا۔ خان گڑھ والوں نے اپنی محبت کا اظہار یوں کیا کہ پورے بازار کی دکانیں بند رہیں۔ عصر کے بعد اباجی فرمانے لگے کہ صبح سے لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کر بیٹھے ہیں۔ کب تک یوں ہی انہیں بٹھائے رکھوں۔ حافظ کی قسمت میں منہ دیکھنا نہیں ہے تدفین کر دیتے ہیں۔ اماں جی! بے چاری تا خاموش رہیں کہتیں بھی کیا اور اباجی اپنی لاڈلی بیٹی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر اس کی آخری آرامگاہ تک لے گئے۔ وہ بے چاری کُل پونے دو برس زندہ رہی۔ بھائی جان معصوم بہن کو آخری بار نہ دیکھ سکنے پر پھوٹ پھوٹ کر روئے مگر کیا ہو سکتا تھا۔ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ اُس کی وفات کے بعد دل اور اُچاٹ ہو گیا۔ کسی کا بھی خان گڑھ میں رہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ تینوں بھائی چھوٹے تھے۔ تعلیم کا وہاں کچھ بندوبست نہ تھا۔ پانی پت کے جناب قاری عبدالرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہاجر ہو کر آ وہاں آ گئے تو عارضی طور پر بھائی اُن سے حفظ کرنے لگے۔ اسی اثناء میں رمضان المبارک آ گیا۔ بھائی جان! ملتان سے تعطیلات میں گھر آئے ہوئے تھے وہ سنانے لگے۔ آخری عشرہ میں ایک دن ملتان سے جناب ملک عبدالغفور صاحب انوری اور ملک عطاء اللہ صاحب یہ خوشخبری لے کر پہنچے کہ مکان ڈھونڈھ لیا گیا ہے آ کر دیکھ لیں۔ انہیں اباجی نے فرمایا کہ عید کے بعد آ کر دیکھیں گے چند ہی دن رمضان کے باقی تھے۔ وہ نمازِ فجر پڑھ کر ملتان واپس آ گئے۔ دوپہر کو سب آرام کر رہے تھے ظہر کا وقت ہوا تو ہمسائے نے پردہ کرنے کی تین آوازیں دیں جو ملتان کے علاقہ کا بڑا ہی شریفانہ اور اسلامی طریقہ ہے۔ دیکھا گیا تو وہ اپنے صحن میں آم کے درخت پر چارپائی باندھ رہا ہے۔ چھوٹا موٹا سامان رکھنے کے لیے۔ پوچھنے پر اس نے کہا سائیں دریائے چناب کا بند ٹوٹ گیا ہے پانی شہر کی طرف آ رہا ہے۔ پریشانی میں ظہر پڑھی گئی ہنڈیا چولہے پر رکھی تو لمحہ بہ لمحہ خبریں آنے لگیں۔ پانی شہر میں داخل ہو گیا "گلاں کی بستی" ڈوب گئی۔ پانی ہسپتال تک آ پہنچا۔ اتنے میں نواب صاحب کا پیغام آیا کہ بنگلے میں تشریف لے آئیں اور چند لمحے بعد سنا کہ بنگلے کی سیڑھیاں پانی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ پھر ایک معتقد خواجہ عبدالرشید صاحب نے آ کر کہا میرا چوبارہ ہے آپ کے لیے فارغ کر دیا ہے وہاں آ جائیں۔ اس کے منہ سے نکل گیا وہ اونچا ہے اباجی نے فوراً اسے ٹوکا یوں مت کہو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے نے ایسے ہی کہا تھا۔ ویسے چلے

چلتے ہیں۔ پکتی ہنڈیا چولہے سے اتاری افطار کا وقت ہونے والا تھا کہ کھانے کے برتن پاس ہی سر خواجہ صاحب کے چوبارے پر دوبارہ پناہ گزیں ہوگئے۔ اباجی اور چند معتقد گھر رہے۔ ضروری چیزیں اٹھوائیں اور جس وقت بھائی جان تراویح پڑھا کر گھر آئے تو پانی بیرونی دیواریں گرا کر صحن میں آچکا تھا۔ کسی نے کہا "ھُن تاں اٹھو کیا سوچیندے پئے او" تو اباجی بھی خواجہ صاحب کے ہاں آگئے۔ چھ روز ہم وہیں محصور رہے۔ قیامت کا سماں تھا۔ نچلی منزل میں صاحب خانہ ان کے اہل و عیال اور کنبے کے آفت زدہ افراد بھرے پڑے تھے اوراوپر ہم لوگ! ایک رات تو ایسی آئی کہ پانی اس بند سے بھی ٹکرانے لگا جو شہر کے بچے کھچے حصے پر باندھ کر لوگ پناہ لئے بیٹھے تھے۔ آدھی رات کے بعد لوگ گلیوں میں آوازیں دے کر آدمیوں کو اکٹھا کر رہے تھے تاکہ بند کو مضبوط بنایا جاسکے۔ اباجی جاگ رہے تھے ہم ماں بیٹی سے فرمایا اٹھو! وضو کر کے مصلے پر آجاؤ (خود تو بیٹھے ہی تھے) مرنا ہی ہے تو اللہ کا نام لیتے ہوئے تو مریں۔ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا۔ لوگوں کی محنت بارآور ہوئی اور بند ٹوٹنے سے بچ گیا۔ ملتان اطلاع پہنچ چکی تھی اور اباجی کے احباب مکان کا قبضہ لے کر راستے کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ چھ روز بعد پانی کچھ کم ہوا تو ہم لوگ تانگوں میں مظفر گڑھ روانہ ہوئے۔ حد نگاہ تک پانی ہی پانی تھا۔ راستے میں دیکھا درخت جڑ سے نکل کر سڑک کے کنارے گرا پڑا تھا۔ دونوں تانگوں کے بم پکڑ کر چار آدمی ساتھ چل رہے تھے۔ مبادا سڑک ٹوٹی ہو اور پتہ نہ چلے! اور ہمارے کپڑے اور برقعے گھٹنوں تک پانی سے بھیگے ہوئے تھے۔ دو گھنٹوں میں دو میل کا سیلاب زدہ رقبہ طے ہوا اور ظہر کے قریب ہم مظفر گڑھ پہنچے اللہ تعالیٰ مخلصین کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ ایک زنانہ سکول کھلوا کر قیام کا بندوبست کر رکھا تھا۔ رات وہاں گزاری اور دوسرے روز گاڑی میں ملتان روانہ ہوئے۔ لائن کئی جگہ پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گاڑی اس رفتار سے چل رہی تھی کہ چند بار دیکھا کچھ لوگ اترے اور پانچ منٹ بعد بھاگ کر پھر سوار ہو گئے۔ عصر کے بعد ملتان پہنچ سکے اور تانگہ مدرسہ قاسم العلوم کے پاس پہنچا تو افطار کا وقت ہو گیا۔ سڑک ہی پر پانی سے روزے کھولے۔ اور پھر اس گھر میں داخل ہوئے جہاں سے اباجی کا جنازہ ہی اٹھا! مگر اس ساری مصیبت میں ایک لفظ اُن کی زبان سے شکوے کا نہیں سنا۔ استغفار ہی پڑھتے رہے۔ اباجی کبھی کسی کی برائی نہیں سوچتے تھے۔ انگریز اور مرزائی کے سوا۔ خاندان کا "بابو" طبقہ یوں ملّا سمجھ کر حقارت سے دیکھتا مگر کسی مفاد کے لئے ضرورت

پڑتی تو شہرت سے فائدہ اٹھانے سے گریز نہ کرتا۔ کئی تذکرہ نگاروں نے ایک بھانجے کا قصہ لکھا ہے بھانجا تو کوئی تھا ہی نہیں۔ رشتہ کی پھوپھی تھیں۔ ان کا لڑکا تھا۔ گھر میں کچھ سرزنش ہوئی تو بھاگ کر جبل پور چلا گیا اور فوج میں بھرتی ہوگیا۔ ماں فوت ہو چکی تھیں۔ خالہ جنہوں نے پالا تھا روتی تھیں۔ برخوردار ناز و نعم کے پلے ہوئے تھے۔ فوج کی مشقتوں نے چھٹی کا دودھ یاد دلایا تو گھر والوں کو "مولوی صاحب" یاد آئے پھر ایک کارڈ اباجی کا جبل پور گیا اور ہفتہ کے اندر صاحبزادے ڈسچارج ہو کر گھر تشریف لے آئے کبھی قرابت داروں کے سلوک کا قصہ چھڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ خاموش رہتے۔ پھر فرماتے خدا کے لئے اس تذکرۂ بد کو ختم کردو۔ گھر کی برکت اُڑ جائے گی۔ تمہیں خدا نے کس چیز کی کمی دے رکھی ہے؟ بیٹا اپنا معاملہ خدا سے درست رکھو کبھی کسی کا بُرا نہ مانگو پھر دیکھو خدا کیا کرتا ہے! اباجی محمودوار تھے۔ شکرِ نعمت سے ان کا دل لبریز تھا۔ غرور اور تکبر ان کے پاس سے نہ گزرا تھا۔ ہمارے دادا جی کے دو چچا اور ایک پھوپھی امرتسر میں آباد ہوئے ان کی اولاد تقسیم تک وہیں آباد تھی۔ ان سب گھروں میں ایک کشمیری خاتون کام کاج کیا کرتی تھی۔ ہمارے بچپن میں وہ ضعیف العمر تھی اور امرتسر میں پورے خاندان کے خورد و کلاں کی "ماسی"۔ ایک دن اباجی "کٹڑہ رام گڑھ" سے گزر رہے تھے سامنے سے ماسی آگئی اباجی نے سلام کیا وہ وہیں گلی میں بیٹھ کر اپنا حال احوال سنانے لگی۔ اباجی وضع داری میں وہیں اس کی بات ختم ہونے تک کھڑے رہے ماسی بہت خوش ہوئی کہ شاہ جی نے میرا حال سُنا۔ گھر آکر یہ قصہ سُنایا اور فرمایا کہ جب ماسی نے روکا تو مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم یاد آگئے انہوں نے بھی اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا کی باتیں ایسے ہی ایک دفعہ سُنی تھیں۔ کسی کی بیٹی روٹھ کر میکے بیٹھ جائے تو انہیں بہت دکھ ہوتا تھا۔ ملتان آئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ محلہ میں چند گھروں کے متعلق معلوم ہوا کہ ان کی بیٹیاں روٹھی ہوئی ہیں۔ فریقین کو بلایا اور جب تک دو لڑکیاں سسرال نہیں چلی گئیں انہیں چین نہیں آیا۔ ایک دو صاحب حیثیت مرید اپنی زکوٰۃ ان کی تحویل میں استعمال کے مکمل اختیار کے ساتھ دے دیتے تھے۔ اباجی نے ٹبّی شیر خاں میں پانچ غریب لڑکیوں کا جہیز اس رقم سے تیار کرایا اور والدین کو بیٹیوں کی رخصتی میں مدد دی۔ ایک گھر میں نلکا لگوایا۔ محلہ کی مسجد بی بی عائشہ ٹوٹ رہی تھی اپنے احباب کو توجہ دلائی۔ خصوصاً حاجی دین محمد صاحب مرحوم کو جو مرید تو حضرت مولانا احمد علیؒ کے تھے مگر اباجی سے بھی بہت محبت تھی۔ وہ لاہور سے تشریف لائے۔ اپنا پکا تے کھاتے اور پلّے سے لگا کر مسجد

کی مرمت کی مگر " بیماریٔ دل " میں مبتلا لوگوں نے ایک طرف تو کسی ملتانی پیر سے بکرے کی سِری ٹونا کرا کر حاجی صاحب کی رہائش گاہ میں پھینکی اور اُدھر متولی حضرات کے کانوں میں ڈالنا شروع کیا کہ شاہ جی کا ارادہ مسجد پر قبضہ کرنے کا ہے! حاجی صاحب اس قصّہ سے بددل ہو گئے، حسبِ دل خواہ تو نہیں مگر بہرحال مسجد تعمیر کر کے واپس چلے گئے۔ اباجی کے کہنے پر بھائیوں نے چند بار رمضان میں وہاں قرآن پاک سنایا۔ اباجی نے مسجد کے ہمسایہ زمیندار سے تھوڑی سی زمین بھی خرید کر مسجد میں شامل کی۔ کھیتوں میں کچھ حضرات رفع حاجت کے لئے مسجد سے گزر کر جاتے تھے وہاں دیوار بنوادی۔ کچھ لوگوں نے بڑی دل شکن باتیں کیں۔ بھائیوں کو طیش آیا تو فرمانے لگے۔ میں نے جو کچھ کیا اللہ کے لئے کیا۔ ایک سیدزادی کی بنوائی ہوئی مسجد تھی میں نے دیکھا ٹوٹ رہی ہے بنوادی۔ تم نماز کہیں اور پڑھ لیا کرو۔ جانا ہی چھوڑ دو۔ بعض وقت سوچتی ہوں اباجی کیا تھے اور لوگوں نے کیا کہا ؟
ہماری سب سے بڑی بہن پیدا ہوئی تو وہ میانوالی جیل میں تھے اسے دیکھا بھی نہیں وہ فوت ہوگئی۔ مجھ سے بڑی بہن چار ماہ کی تھی تو وہ اپنے مشہور دَورہ پر نکلے وہ سوا سال کی ہو کر رخصت ہوگئی اور اُسے فوت ہوئے چند ماہ گزر چکے تھے جب اباجی دیناج پور جیل سے رہا ہو کر تشریف لائے۔ کیا یہ سب کسی دنیوی مفاد کے لئے تھا ؟ انہوں نے جدوجہدِ آزادی میں جان کی بازی لگا کر حصّہ لیا۔ آخری بیماری میں ملتان کے مشہور معالج ڈاکٹر خان دیکھنے آتے تو کہنے لگے شاہ صاحب آپ کو خدا نے سو سال تک نہ گھُلنے والا جسم دیا تھا جسے آپ نے تیس [30] برس میں ختم کر دیا۔ تارا سنگھ نے خون کی ندیاں بہانے کی بڑھک ماری تو جواب انہوں نے ہی دیا۔ کشمیر اور کپورتھلہ کی غیر مسلم ریاستوں کے خلاف تحریک ان کی جماعت نے چلائی۔ راج پال کا فتنہ انہوں نے کچلا۔ ایک واقعہ یاد آ رہا ہے ۲۱ء میں جب میانوالی جیل میں تھے کانگریس کا سربرآوردہ کارکن سردار منگل سنگھ ایم ایل اے بھی ساتھ تھا۔ اُس سے دوستانہ تعلقات تھے۔ نواکھالی یا بہار کے فسادات میں اس نے مسلمانوں کے قاتلوں کی پشت پناہی کی۔ اباجی کو اطلاع مل گئی! ۴۷ء میں جب ہم لوگ دفتر احرار میں مقیم تھے تو ایک عقیدت مند نسل کریم صاحب سیٹھی چند دن کے لئے دورہ پر سرحد لے گئے۔ واپسی پر رُودادِ سفر سناتے ہوئے فرمایا۔ جب پشاور اسٹیشن پر اترے تو دیکھا منگل سنگھ دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔ پاس آ کر معانقہ کے لئے ہاتھ بڑھائے مگر میں نے ہاتھ نیچے کر کے کہا اب نہیں : میری قوم کو مروا کر مجھ سے معانقہ کرنے آئے

ہو؟ اور قوم !!!!؟ امرتسر کا مکان بر لبِ سڑک تھا بیٹھک کی کھڑکیوں پر چقیں پڑی رہتیں۔ ایک دن دیکھا دو شخص گزر رہے تھے ایک نے دوسرے سے پوچھا یہ کس کا مکان ہے؟ دوسرا اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اباجی کی جسامت کی نشان دہی کرتے ہوئے بولا۔ عطاء اللہ شاہ کا شہید گنج کا پیسہ لے کر بنایا ہے! ۲۴۰۰ روپے میں، مولانا بہار الحق قاسمی مرحوم سے خریدا ہوا مکان جو اماں جی کا زیور بیچ کر اور قرض لے کر خریدا گیا تھا۔ اباجی گھر میں ہوتے تو معمولی باتوں کا بھی دھیان رکھتے کبھی کبھی ہم بہن بھائیوں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے" کبھی" اس لئے کہ ابھی سفر سے واپسی پر سامان رکھا جا رہا ہوتا تھا اور ملاقاتی آن موجود ہوتے تھے مگر جب موقع ملتا تو پھر سمجھاتے بھی تھے۔ لقمہ چھوٹا لو۔ منہ میں پھاڑو مت، ایک طرف رکھ کر چباؤ دستر خوان سے سالن والا ہاتھ نہ پونچھتے رہو۔ ہڈی پاس کسی برتن میں رکھو نیچے مت گراؤ۔ پھل کھا کر چھلکا زمین پر مت پھینکو۔ وہ گھر سے رخصت ہونے سے لے کر واپسی تک کی روداد سفر ہمیں سناتے اور ہمیں یوں محسوس ہوتا کہ ہم اباجی کے ساتھ ہی تھے ایک کے بعد دیگرے بھائی حفظ کرتے رہے اور جب پہلی دفعہ کوئی تراویح میں پڑھتا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔ کئی دفعہ ختم پر دیگ پکوا کر تقسیم کی۔ اچھے شعر سناتے تھے بلکہ یاد کراتے تھے۔ ایک روز میں نے کہیں پڑھا ؎

فغاں کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے
سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا

شام کے وقت کمرے میں برتن نکال رہی تھی صحن میں لے جانے کے لئے تو پھر شعر یاد آیا پڑھنے کو جی چاہا اور میں نے اپنی یہ خواہش پوری کر لی۔ برتن لے کر مڑی تو دروازے میں اباجی کھڑے مسکرا رہے تھے میں بہت نادم ہوئی ذرا اونچی آواز سے پڑھا تھا۔ فرمانے لگے کیا پڑھ رہی تھیں پھر سنانا پڑا۔ فرمانے لگے بس ابا کی زندگی یہی ہے۔ بچپن میں ایک شعر سنایا تھا اب تک یاد ہے۔

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

"بٹیا" تو مجھے ساری عمر کہا مگر جب میری پہلی بچی باتیں کرنا سیکھنے لگی تو بٹیا جی کہنا شروع کر دیا ان کے منہ سے اپنا اتنا ادب مجھے بہت محجوب کرتا آخر ایک دن کہا کہ اباجی اب آپ مجھے

جی کہتے ہیں شرم آتی ہے فرمانے لگے نبی کے لئے کہتا ہوں تاکہ جی سنے اور جی کہے!

جنرل محمد ایوب خان کے زمانہ کی بات ہے۔ سکھ یاتری پہلی مرتبہ پاکستان آئے اور زندہ دلان لاہور نے یوں استقبال کیا جیسے عزیز واقارب سفرِ حج سے واپس آئے ہوں۔ اباجی نے اخبار پڑھا اُس روز عصر تک بیٹھک ہی میں بیٹھے رہے اندر نہیں آئے۔ عصر کے وقت آئے اور خاموش خاموش صحن میں ٹہلنے لگے۔ اماں جی نے چائے کا پوچھا تو فرمانے لگے صبح سے میرا خون کھول رہا ہے! قوم دیّوث ہوگئی ہے اب کن کا استقبال کر رہے ہیں؟ ایک لاکھ جوان کٹوائے۔ ساٹھ ہزار بیٹی ہندو سکھوں کے قبضہ میں دی۔ فاطمہ اور عائشہ نام کی لڑکیوں کے بطن سے ہر نام سنگھ اور لچھمن سنگھ پیدا ہوئے اور اب پھر اُنہی کو بلا کر گلے مل رہے ہیں۔ اے کاش! آج میری صحت ہوتی تو لاہور میں تقریر کرتا۔ مرض الموت حقیقت میں سکھر جیل سے شروع ہوچکا تھا۔ جہاں بارہ آنے سیر کے چھیچھڑے گوشت کے نام پر پکائے جاتے۔ مسور کی دال اور گلے سڑے بینگن کھلائے جاتے۔ ایک بزرگ حج سے واپس آئے اور کہا مجھے مدینہ طیبہ میں زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف حاصل ہوا انہوں نے فرمایا عطاء اللہ شاہ کو میرا پیغام دینا کہ میری نبوّت پر کتنے حملہ آور ہیں تم آرام سے مت بیٹھو (ان بزرگ کی روایت کے الفاظ ہیں۔ واللہ اعلم) اُس دن وہ بہت روئے اور بار بار فرمایا مجھے پیغام آیا ہے؟ پھر جب تک ان میں ذرا بھی سکت باقی رہی انہوں نے اپنی پوری توانائیاں عصمتِ رسول اور ختمِ نبوت کے بیان میں صرف کیں۔ فالج کا پہلا حملہ ہونے سے چند روز قبل چند دانت نکلوائے یوں تو چاول شوگر کا علم ہونے پر چھوڑ دیئے تھے مجبوری کی بناء پر ان دنوں میں دو تین دن کھچڑی کھائی۔ زندگی کے آخری برسوں میں مغرب سے عشاء تک اوراد میں مشغول رہتے تھے اور عشاء پڑھ کر کھانا کھاتے تھے اس روز وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ مولوی محمد علی صاحب جالندھری مرحوم آکر بیٹھ گئے۔ عشاء کے بعد تک کسی مجلسی مسئلہ پر گفتگو کرتے رہے۔ اماں جی چولھے کے پاس بیٹھی تھک گئی تھیں۔ نماز پڑھ کر لیٹ گئیں۔ میں بیٹھی رہی۔ کھچڑی ایسا کھانا ہے کہ پکنے کے بعد تیز آنچ پر نہیں رکھا جاسکتا۔ انکا دل پر دیگچی پڑی رہی۔ مولانا اُٹھ کر گئے تو اباجی اندر آئے۔ برآمدے میں پلنگ پر بیٹھ کر کھایا کرتے تھے دہیں چولھے بنے ہوئے تھے۔ میں نے کھچڑی نکال کر دی تو نیم گرم بھی کھاتے کھاتے ٹھنڈی ہوگئی۔ کھاتے ہوئے دو دفعہ فرمایا آج میرے جسم میں ایک خاص کیفیت ہے پھر کُلّی کی اور بیٹھک میں چلے گئے۔ میری طبیعت

میں تشویش سی پیدا ہوئی ہیں پھر جاکر بیٹھک میں دری پر بیٹھ گئی فرمانے لگے پان کھالو۔ جی نہیں چاہ رہا تھا محض ان کے کہنے کی بنا پر میں نے ایک ٹکڑا لگا کر منہ میں رکھ لیا۔ فرمانے لگے جاؤ آرام کرو۔ اگلا لفظ صاف کرکے کہا۔ ان کے الفاظ صحیح سمجھ نہیں آتے تھے مگر میں نے سمجھا کہ دانت نکلنے سے منہ متورم ہے اس لئے اس طرح بول رہے ہیں۔ علی الصباح دو اُٹھے تو انہیں محسوس ہو گیا کہ دایاں بازو صحیح کام نہیں کر رہا مگر وضو کر کے مسجد سے باجماعت نماز پڑھ کر آئے اور مصلے پر اپنا کالا کمبل اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ معمول یہ تھا کہ مسجد جانے سے قبل برآمدے میں آکر السلام علیکم یا اھل البیت صبحکم اللہ بالخیر فرماتے اور بھائیوں کو نام لے لے کر آواز دیتے اور اُٹھا جاتے اس روز اندر نہیں آئے۔ میں نماز پڑھ کر اپنے دونوں بچوں کو لے کر بیٹھک میں گئی۔ یہ بھی روز کا معمول تھا۔ بچے اٹھتے ہی مچلتے تھے کہ نانا ابا جی کے پاس لے چلیں۔ کپڑے پہنا کر لے جاتی مصلے پر بیٹھے بیٹھے دونوں کو چومتے ایک پچھلے سلام کر کے تھوڑی سی دیر بیٹھ کر آجاتے۔ پھر ناشتہ کے لئے اندر آتے تو ساتھ بٹھا لیتے۔ اس روز میں نے جاکر سلام کیا تو پڑھتے ہوئے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور میری طرف دیکھ کر بایاں ہاتھ دائیں پر پھیرا اور نفی میں ہلایا۔ ایک سیکنڈ میں میں سمجھ گئی وہ کیا کہہ رہے ہیں مگر میرا دل کہتا تھا کہ کاش یہ نہ ہو۔ میں فوراً ہی واپس اندر گئی اور اماں جی سے رک رک کر کہا ابا جی کی طبیعت خراب ہے شاید ان کے بازو کو کچھ ہو گیا ہے۔ دو منٹ کے اندر اندر ہم ماں بیٹی پھر بیٹھک میں آگئیں انہوں نے تسبیح مکمل کر کے بتایا کہ اٹھا ہوں اور زبان کا چلانے لگا تو ہاتھ کام نہیں کر رہا تھا میں نے جیسے تیسے وضو کیا اور کلمہ پڑھا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ لَا نَبِیَّ بَعْدَهٗ وَلَا رَسُوْلَ بَعْدَهٗ۔ اور پھر بھی زندہ رہا تو مسجد چلا گیا۔ اماں جی نے عرض کیا جب آپ نے محسوس کیا کہ طبیعت ٹھیک نہیں تو ہمیں کیوں آواز نہیں دی اور پھر ٹھنڈے پانی سے وضو کر لیا تو فرمایا کہ یہ سوچا جو ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے پریشان کیا کروں۔ اماں جی نے فوراً ہی چائے بنائی۔ دوا المسک وغیرہ کھا کے چائے پی۔ دھوپ نکلی تو صحن میں بستر بچھا کر ہم لوگ ان کو بیٹھک میں سے لے آئے۔ جناب حکیم عطاء اللہ خان صاحب رح (جو ہمارے ہاں بڑے حکیم صاحب کہلاتے تھے) کو بلایا انہوں نے آکر غذا وغیرہ قطعاً بند کر کے ماء العسل اور دیگر ادویہ دیں۔ یہ خبر شہر بھر میں پھیل گئی کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور جوق در جوق لوگ عیادت کے لئے آنے لگے مجبوراً برآمدے کی چقیں گرا کر ہم اندر گئیں اور ملاقاتی صحن میں ہی آکر ملنے

لگے۔ جماعت اسلامی کے باقر خان صاحب اور بابر نصیر اسد صاحب بھی آئے انہوں نے اپنا تعارف کرایا کہ ضلع جالندھر کے فلاں گاؤں میں آپ گئے تھے اور میں نے وہاں آپ کو دیکھا تھا۔ اتنی تکلیف میں بھی کہ اس وقت تک لقوہ کا اثر بھی چہرے پر ظاہر ہو رہا تھا مسکرا کر فرمانے لگے "وہ کیسے ٹھیک گلی جیسے بھاپ ہو نہیں کھلی" اور بڑے مزے سے ان کو بتایا کہ دانت نکلوانے کی وجہ سے چند دن سے کھچڑی کھا رہا تھا اور رات کچھ ٹھنڈی ہو گئی تھی اپنی طرف سے یہ کسر باقی رکھی ہے کہ گھڑے کا پانی نہیں پیا۔

بیماری کے ایام میں ایک صبح فرمانے لگے کہ آج ضعف بہت ہے چلا نہیں جاتا۔ پھر ناشتہ کیا (ناشتہ ہوتا کیا تھا؟ دو انڈوں کی زردی، دو تین بسکٹ اور دو پیالی چائے۔) پھر فرمانے لگے کہ چلتا ہوں ذرا حنیف اللہ تک! (حکیم حافظ حنیف اللہ صاحب ابن الحاج حکیم عطاء اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ) میں نے عرض کیا اباجی! ضعف ہے مت جائیے۔ فرمانے لگے ذرا دل بہل جاتا ہے کلہاڑی ٹیکتے ہوئے دروازہ تک گئے تھوڑی دیر بعد دیکھتی ہوں تو زنانہ دروازے کے سامنے پردہ کے لئے جو دیوار بنی تھی۔ اس کے پاس کھڑے ہیں۔ آواز دی "بٹیا" میں جی کہہ کر بھاگتی ہوئی آئی تو دیکھا کپڑے مٹی سے بھرے ہوئے ہیں۔ فرمایا بٹیا میں گر پڑا۔ میں ان کی حالت دیکھ کر رو پڑی۔ کپڑے جھاڑے، عرض کیا اباجی میں نے تو کہا تھا آج نہ جائیے! فرمانے لگے! دروازہ کھولا ہی ہے کہ گر پڑا۔ پھر میرے بازو کا سہارا لے کر گھر کے برآمدے میں آکر بیٹھ گئے۔ بار بار یہ کہتے رہے' تم نے تو منع کیا تھا میں نے نہ مانا اور گر پڑا۔ میری ایک معمولی سی بات کا اتنا تاثر۔ ان کی شفقت کی انتہا نہ تھی؟

لدھا رام والے کیس میں گرفتار ہونے سے چند روز قبل وہ مظفر گڑھ تشریف لے گئے ایک روز صبح اماں جی چولہے کے پاس بیٹھی ناشتہ بنا رہی تھیں۔ میں اور بھائی جان پاس بیٹھے تھے کہ ڈیوڑھی کے دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی آواز آئی "پھوپھی جی السلام علیکم" یہ بھائی عزیز الرحمٰن صاحب لدھیانوی مرحوم و مغفور تھے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کے صاحبزادے۔ وہ سب بہن بھائی اماں جی کو پھوپھی کہا کرتے تھے۔ اور پھر دیں سے انہوں نے کہا شاہ جی گرفتار ہو گئے! اماں جی خاموش رہیں۔ انہوں نے بیٹھک

بیٹھ کر ماموں جان اور بھائی جان کو تفصیلات بتائیں اور چلے گئے غالباً تیسرے دن ابا جی کا منٹگمری سے لکھا ہوا پوسٹ کارڈ بھی موصول ہو گیا۔ مجھے بس اتنا یاد ہے اس میں گرفتاری کی اطلاع تھی جب ابا جی گجرات منتقل ہو گئے تو بھائی جان اور ماموں جان ہر پیشی پر گجرات جایا کرتے تھے۔ ایک روز میں نے ضد کی کہ ابا جی سے ملنے جانا ہے تو اس روز نہ تو ماموں جی مانے اور نہ بھائی جان۔ ان کے جانے کے بعد میں خوب روئی۔ اماں جی نے تو کبھی بھی جیل جا کر ملاقات نہیں کی مگر میری منتوں سے ان کا دل پسیج گیا اور اس سے اگلی پیشی پر انہوں نے ماموں جی کو آمادہ کر لیا اور وہ مجھے گجرات ساتھ لے گئے۔ اس وقت تو مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ ماموں جی نے مجھے ایک کھلی جگہ گھاس پر بٹھا دیا۔ برقعہ میں نے پہنا ہوا تھا اتنا یاد ہے بڑا ہجوم تھا لوگوں کا۔ کافی دیر بعد کہنے لگے۔ آؤ چلو۔ یاد آتا ہے ایک کمرا تھا جس میں سرخ رنگ ہو رہا تھا۔ ابا جی کرسی پر بیٹھے تھے۔ میں، ماموں جی، بھائی جان اور عاجز چچا مرحوم[1] داخل ہوئے۔ میں ابا جی سے لپٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔ انہوں نے مجھے گود میں بٹھا لیا پیار کیا اور کہا دیکھو سامنے کمرے کی کھڑکی میں سے ایک عمارت نظر آ رہی تھی کہنے لگے وہ دیکھو کیسی اچھی جگہ ہے میں وہاں رہتا ہوں بھائی جان نے پہلا محراب جب پڑھا تو وہ قید ہی میں تھے۔ عید سے پہلے میں نے ایک دن اماں جی سے کہا مجھے ریشمی کپڑے بنا دیجیے غالباً کسی لڑکی کے دیکھ کر یا ویسے ہی کہے انہوں نے صرف یہ جواب دیا کیا تمہیں معلوم نہیں تمہارے ابا جی قید ہیں؟ میں بھلا کیا سوچتا تھا۔ میں نے زندگی کا سب سے پہلا خط ابا جی ہی کے نام جیل میں لکھا اماں جی نے پنسل سے کچا کر دیا اور میں نے اس پر قلم پھیر دیا۔ پھر مقدمہ ہائی کورٹ میں منتقل ہو گیا جس پیشی پر فیصلہ متوقع تھا اس سے تین دن قبل اماں جی ہر رات مردانے میں اور کچھ خواتین کو بلا کر زنانے میں بھی آیۂ کریمہ کا ختم کرواتی رہیں۔ شہر میں ایک صاحب تھے جو احرار کے جلسوں کی منادی تانگے میں نوبت بجا کر چوک در چوک کیا کرتے تھے۔ تیسرے دن عصر کے وقت عین ہماری بیٹھک کی کھڑکیوں کے سامنے تانگہ آ کر رکا اور ان صاحب نے دھڑا دھڑ نوبت بجانی شروع کی اور فرطِ مسرت سے تمتماتے

---

[1] پنجابی زبان کے عظیم شاعر احرار جناب خواجہ عبدالرحیم عاجز عرف حبہ

چہرے کے ساتھ اباجی کی رہائی کا اعلان کیا۔ میں نوبت کی آواز سن کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی تھی اباجی کی رہائی کی خوشخبری سن کر بھاگتی ہوئی اماں جی کے پاس آئی وہ صحن اور دالان میں نہیں ملیں، میں کوٹھڑی میں گئی تو وہ مصلے پر سر بسجود تھیں۔ یہ سجدۂ شکر تھا! منادی والا مبارک دے کر چلا گیا اور ہمسائیاں مبارک باد کہنے آنے لگیں اب انتظار کی گھڑیاں ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ ہمارے ہمسایوں نے تو چراغاں کیا تھا خوشی میں۔ رات نو دس بجے کا وقت ہوگا۔ ہم سب چھت پر سوئے تھے اچانک جو میری آنکھ کھلی تو ساتھ والی چارپائی پر اماں جی نہیں تھیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو "گھپ" میں سے صحن کی روشنی اوپر آ رہی تھی ہڑبڑا کر اٹھی نیچے دیکھا تو بیٹھک میں سے روشنی اور آوازیں آ رہی تھیں دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اتری اور بیٹھک میں پہنچ گئی۔ اباجی، بھائی جان، مامنوں جی اور اباجی کے بچپن کے رفیق جناب حافظ محمد سعید صاحب مرحوم (مغفور) تشریف لا چکے تھے اور سامان رکھ رہے تھے میں اباجی سے لپٹ گئی اور میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے!

۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں جب، اباجی قید تھے۔ تو کئی مہینوں کی کوشش کے بعد ملاقات کی اجازت ملی۔ تینوں چھوٹے بھائی عطاء المحسن، عطاء المؤمن، عطاء المہیمن اور میں ابوالکمال کے ساتھ سکھر اباجی سے ملنے گئے۔ ان کو تو جیل کے اندر جانے کی اجازت نہ دی گئی کہ "دامادِ قانوناً اہلِ خانہ میں شامل نہیں" وہ باہر کھڑے رہے۔ ہم چاروں بہن بھائی جیل کے پھاٹک پر کھڑے تھے کہ سامنے ہشاش بشاش اباجی آتے دکھائی دیئے۔ ابوالکمال تو باہر کھڑے صرف مصافحہ ہی کر سکے۔ سنتری نے تالا کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ ڈیوڑھی میں ہی سیڑھیاں تھیں۔ اباجی ہمارے ساتھ ہی اوپر آ گئے کمرے میں ایک لمبا میز اور کرسیاں رکھی تھیں ایک پر جیلر بیٹھ گیا۔ ایک پر اباجی اور باقی پر ہم۔ گھر کا حال احوال پوچھا بھائیوں سے تعلیم کا پوچھا۔ نصیحتیں کیں۔ اباجی نے جیلر سے پوچھا کہ داماد کو ملاقات کی اجازت کیوں نہیں وہ کہنے لگا "داماد" کیا ہوتا ہے؟ عطاء المحسن سلمہٗ نے کہا "سن ان لاء" تو پھر اس نے قانونی مجبوری بیان کی پون گھنٹہ کے قریب ہم بیٹھے۔ حبس، تپش، خراب آب و ہوا، ناقص غذا اور اسی قسم کی دیگر ابتلاؤں کے سبب صحت بہت دگرگوں تھی۔ بالخصوص چہرہ اور سینہ پھوڑوں پھنسیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر اباجی نے اپنی کسی تکلیف کا ذکر تک نہیں فرمایا۔ پھر وہ ہمارے ساتھ ہی سیڑھیاں اترے اور اتنی بات کہی کہ رات رکنا مت

شاید آج ہی چاند ہو جائے شعبان کی اس دن انتیس تھی نا۔ اور پھر ہم تو سلاخوں سے لگے انہیں جیل کے اندر جاتا دیکھتے رہے۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اور رہِ عشقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مسافر پیچھے مڑ کر دیکھا بھی کب کرتے ہیں۔

ملتان میں حکماء اور نشتر کالج کے ڈاکٹروں کا ہر حیلہ جب ناکام ہو گیا تو ان کی خواہش پر ان کو گھر لے آئے پھر ان کے ہمدمِ دیرینہ جناب چچا شیخ حسام الدین صاحب کے پُر زور اصرار پر بادلِ نخواستہ اماں جی لاہور لے جانے پر راضی ہو گئیں۔ مولوی محمد اکرم یکے از مالکان سلطان فونڈری کے ہاں قیام رہا مگر چند دن کے عارضی افاقہ کے بعد نقاہت پہلے سے بھی بڑھ گئی تو والدہ ماجدہ سب کی مخالفت کے باوجود واپس گھر لے آئیں اور یہ ان کا ہم پر احسانِ عظیم تھا۔ ہم بہن بھائی بٹے ہوئے تھے کچھ لاہور کچھ ملتان۔ اس طرح ہم دمِ واپسیں تک ان کی خدمت میں اکٹھے حاضر رہے!

لاہور سے واپس گھر آنے پر طبیعت ہم سب کے اکٹھے ہونے سے بھی نسبتاً بہتر ہو گئی لیکن یہ چراغ بجھنے سے پہلے لَو کا اونچا ہونا تھا!

وفات سے تقریباً بارہ تیرہ دن قبل غسل فرمایا۔ والدہ ماجدہ نے سر میں بادام روغن لگایا اور بڑے عرصہ بعد اُس دن سرمہ بھی لگایا چہرہ اس دن ایسے روشن تھا جیسے بیمار ہیں ہی نہیں۔ غسل کے بعد نماز ظہر پڑھی کچھ لیٹے پھر عصر و مغرب بھی ادا کیں مغرب کے بعد دلیہ کھایا اور عشاء کا وقت ہوتے ہی فرمایا نماز پڑھا دو' نماز پڑھ کر لیٹ گئے کمزوری کی وجہ سے سردی محسوس کرتے تھے۔ برآمدے میں پلنگ تھا اور برآمدے کے درے کے سامنے صحن میں بیٹھ کر میں اور اماں جی کھانا کھانے لگی تھیں کہ عزیزی عطاء المحسن سلمہٗ باہر سے آئے اور آتے ہی اباجی کی طرف بڑھے اور پوچھا اماں جی آج اباجی نہائے ہیں، انہوں نے اثبات میں جواب دیا محسن نے اباجی کا ماتھا چومنے کے لئے جیسے ہی منہ رکھا تڑپ کر بولا اباجی کو تو بخار ہے ہم دونوں نے کہا کہ ابھی تو لٹایا ہے کچھ نہ تھا جب آکر ماتھے کو ہاتھ لگایا تو تیز بخار سے تپ رہا تھا۔ اور یہ بخار ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو عصر و مغرب کے درمیان اس وقت اُترا جب انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ ضعف و نقاہت کی شدت کو دیکھتے ہوئے بھی کم از کم مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اباجی ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے ہیں۔

ہفتہ ۱۹ اگست کو میں ظہر پڑھ کر پڑھنے والی بچیوں کو قرآن مجید کا سبق دینے برآمدے میں

آ گئی تو اماں جی، عطاء المحسن، عطاء المومن سلمہ پاس بیٹھے تھے اچانک جو میں نے مڑ کر دیکھا تو ابا جی اور اماں جی آنسو بہا رہے تھے۔ میں متوحش سی ہو کر بڑے کمرے میں آئی تو اماں جی کہہ رہی تھیں کہ مجھ سے آپ کی خدمت نہیں ہو سکی معاف کر دیجئے گا۔ وہ آنکھیں بند کئے خاموش لیٹے تھے۔ پھر اماں جی نے کہا کہ میں تو آپ کے سہارے ہر دکھ بھول گئی تھی (وطن چھوٹنا، املاک کی بربادی وغیرہ) آپ مجھے کس کے سہارے چھوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھا دی! ۲۰ اگست کا دن ایسے ہی گزرا گفتگو موقوف تھی مگر آواز دینے پر پہچانتے بھی تھے اور دوا یا دودھ سوڈا جو بھی ہم دیتے تھوڑا سا پی لیتے۔ ۲۱ کو صبح "محسن" بجائے پاس بیٹھنے کے ایک طرف بیٹھ کر منزل پڑھنے لگا مجھے اچھا نہ لگا۔ میں نے کہا آج اباجی کے لئے کوئی دوا نہیں لاتے کتنی طبیعت خراب ہے۔ گلوگیر آواز میں کہنے لگا "کی کس نے ہے دوا" قانون الٰہی سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی میرا ذہن اباجی کی موت قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ میں دکھی سی ہو کر باہر آ گئی۔ بھائی جان کے مدرسہ کے دس گیارہ طلباء کا کھانا پکایا گھر کے لئے سالن پکایا ایک بجے کے قریب میں فارغ ہوئی تو اماں جی فرمانے لگیں آؤ! اپنے اباجی کے پاس بیٹھو اور یہ دودھ سوڈا پلاؤ میں رات بھی نہیں سو سکی۔ تھوڑی دیر لیٹ گئی۔ میں پلنگ کے ساتھ لگی کرسی پر آ بیٹھی اور آواز دی۔ اباجی تھوڑا سا دودھ سوڈا پی لیں چمچہ منہ سے لگایا انہوں نے پی لیا دو تین چمچے پینے کے بعد منہ بند کر لیا پھر میں نے کہا اباجی پی لیں اور تو کچھ کھاتے ہی نہیں تو چند چمچے اور پی لئے۔ اماں جی اندر میں ظہر پڑھنے لگیں۔ میں پڑھ چکی تو بھائی کہنے لگے۔ بڑے حکیم صاحب آئے ہیں پردہ کر لیں۔ اس وقت شدید بخار تھا۔ ہم لوگ برف کے پانی کی پٹیاں ان کے ماتھے پر رکھ رہے تھے میں اٹھ کر اندر تو آ گئی پر طبیعت بے چین تھی۔ میں دراز میں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ بڑے حکیم صاحب اباجی کے پاؤں کی طرف جھکتے دیکھا بعد میں پتہ چلا وہ کوئی چیز پاؤں سے لگا کر دیکھ رہے تھے کہ حرکت ہے یا نہیں۔ اور اس کے بعد انہوں نے تین آوازیں دیں شاہ جی شاہ جی شاہ جی اور چیخیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ شاہ جی بخار اتر گیا شاہ جی آرام آ گیا۔ شاہ جی صحت ہو گئی! تب مجھے پتہ چلا محسن کیوں کہتا تھا "دوا کی کس نے ہے"! اور بجلی کی طرح یہ خبر پھیلنا شروع ہو گئی مفتی محمود صاحب، عبدالغفور انوری صاحب، حضرت مولانا خیر محمد جالندھری صاحب اور یکے بعد دیگرے کئی حضرات

آنے لگے۔ بڑی مشکل تھی، اندر بیٹھی رہیں اور دقتِ آخر بھی پاس نہ بیٹھیں۔ پھر ہم چادریں لے کر پاس بیٹھ گئیں۔ سب قرآن کریم پڑھ رہے تھے۔ اور وہ باری باری زمزم منہ میں ڈال رہے تھے۔ ایک قطرہ بھی باہر نہیں بہا وہ سکون سے پی لیتے رہے اور چند سانس باقی تھے کہ اماں جی نے متوجہ کیا کہ دیکھو تو زبان ذکر کر رہی ہے اور میں نے دیکھا کہ جس اللہ نے ان کو اقلیم خطابت کا یکتا تاجدار بنایا اور جس کی دی ہوئی قوت کو انہوں نے اُس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے بیان میں ختم کر دیا اُسی کا نام لیتے ہوئے انہوں نے ایک دفعہ آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا اور پھر بند کر لیں۔ میرے اباجی! میرے پیارے اباجی! اس دنیا سے رخصت ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون!

بڑے لوگ پہلے بھی ہوئے اور اللہ کو منظور ہے تو پھر بھی پیدا ہوتے رہیں گے مگر ہم نے اباجی جیسا کوئی نہیں دیکھا۔

میرے ہی چند اشعار ان کی محبت، وشفقت کی نذر ہیں۔

جب کبھی وہ سفر پہ جاتے تھے — دل بہت بے قرار ہوتا تھا

ان کی آمد کا بالخصوص مجھے — رات دن انتظار رہتا تھا

اس زمانہ میں جب کہ بیٹی سے — بات کرنا بھی عار ہوتا تھا

مجھ پہ بیٹوں سے کچھ سوا شفقت — ان کا خاص اک شعار ہوتا تھا

مجھ سے اکثر خطائیں ہو جاتیں — ان کی جانب سے پیار ہوتا تھا

وہ انوکھا پیار کرتے تھے — جان ہم پر نثار کرتے تھے

ہم تو اولاد ہیں وہ عیزوں کو — اس قدر بے قرار کرتے تھے

لوگ اپنوں کو بھول جاتے تھے

جان اُن پر نثار کرتے تھے

اباجی کے ایک مرید تھے جالندھر کے حاجی غلام محمد صاحب تقسیم کے وقت جائیداد ہی کا دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ حواس مختل ہو گئے۔ صحیح ہوں یا دورے میں، آتے ہر صورت تھے دن نمازِ فجر کے وقت، ہی گلی میں چکر لگا رہے تھے اور نجانے کیا کچھ پڑھ رہے تھے اباجی

نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا، سمجھایا بجھایا۔ چائے منگوا کر پلائی۔ وہ چلے گئے۔ موسم خنکی آمیز تھا۔ سنا ہوا ہے بہار میں جنون تیز ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک مصرعہ آیا۔ " جنوں میں فصلِ بہاری ستم ہی ڈھاتی ہے "۔ تقریباً تیس برس بعد اگلے روز یہ مصرعہ یاد آیا اور ابا جی کی یاد میں چند الفاظ موزوں ہو گئے۔

یادِ پدرِ مہربان آید ہمی

جنوں میں فصلِ بہاری ستم ہی ڈھاتی ہے
عظیم باپ تری یاد خون رلاتی ہے

تری وفات نے جینے کی آرزو کھو دی
ترے پیار کی لو حوصلہ بڑھاتی ہے

تری عطوفت در اُفت کی یادیں، کیسے
شعاعِ نُور کہ سینے میں جھلملاتی ہے

تفکرات و حوادث نے کر دیا محزوں
تری حیات ہے قندیل رہ دکھاتی ہے

میں تیرے چہرۂ انور کو دیکھنے کے لئے
ترس گئی ہوں مری روح بلبلاتی ہے

ترے کمالِ خطابت کا تذکرہ جب ہو
عدو بھی کہتے ہیں تاریخ جگمگاتی ہے

عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ اور محاسبۂ مرزائیت کے سلسلہ میں عالمی مجلسِ احرارِ اسلام
اور فرزندانِ امیرِ شریعتؒ
کی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں
عبد الحمید بھٹی (پریس رپورٹر) بھٹی پبلیکیشنز پوسٹ بکس نمبر ۱۵۷ رحیم یار خان

”ابّاجی[1] اور شاہ جی[2]“

مولانا محمد ازہر شاہ قیصر رح

مجھے بڑے لوگوں سے ان کی غائبانہ شہرت کی بناء پر عقیدت و محبت کے تعلقات قائم رکھنے کا سودا ئے خام کبھی نہیں ہوا اور نہ کبھی ایسا ہوا کہ میرے شہر میں کوئی بڑا لیڈر یا بڑا شاعر اور قومی کارکن آیا، ہو اور میں شوق تعارف و ملاقات میں اس کی جائے قیام کے ارد گرد گھومتا رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک غائبانہ شہرت اور اس شہرت کی ہمہ گیری کسی انسان کی بڑائی اور بھلائی کا معیار نہیں۔ بڑائی صرف اخلاق کے لئے ہے اور بڑا آدمی وہ ہے جس کے لئے اخلاق معیاری اور بلند ہوں۔

میرا تجربہ ہے کہ بعض بد اخلاق اور بے کمال انسان بھی بعض وقتی حوادث سے شہرت پا لیتے ہیں ــــ لیکن انکے قریب جا کر جب ان کے کردار کے کچھ گوشوں کو ٹٹولئے تو ان میں اچھے اعمال و اخلاق کا کوئی سرمایہ نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء میں جگرؔ، احسانؔ، روشؔ، سیمابؔ۔ اہل صحافت میں مولانا ظفر علی خان، سالکؔ مرحوم، حامد الانصاری غازی، محمد عثمان فارقلیط قومی رہنماؤں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا حفظ الرحمٰن، ارباب علم و فضل میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد طیب صاحب مولانا احمد علی وغیرہ سے زائد کسی سے میرا تعارف اور تعلق نہیں۔ بڑے آدمیوں کے تعارف و تعلق کے مجھے بہت سے مواقع ملے مگر شاید آپ اس پر اعتبار نہ کریں کہ میں نے خود ان مواقع کو کھو دیا اور کبھی ہر کس و ناکس سے رشتۂ محبت و عقیدت استوار کرنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی صفِ اوّل کے لوگوں میں گاندھی اور جواہر لعل تک میرے قریب سے گرج برس کر گذر گئے لیکن میں نے ذاتی طور پر

---

(۱) حضرت علامہ محمد انور شاہ کاشمیری قدس سرہٗ

(۲) امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔

ان سے تعلق پیدا کرنے میں خود اپنا نقصان سمجھا اور ان بزرگوں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے میرا تعلق بہت قدیم، مستحکم اور نیازمندانہ رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۳۰ء میں انجمن خدام الدین لاہور کے جلسہ میں شاہ جی کو امیر شریعت بنایا گیا تھا، اور میرے والد مرحوم کی تائید کے ساتھ پانچ سو علماء کی ایک جماعت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس جلسہ میں میں نے شاہ جی کو دیکھا شاہ جی ان دنوں جوان تھے سرخ و سپید چہرہ، بھرے بھرے بازو، چہرے پر جلال بدن میں چستی نگاہوں میں چمک، سر پر شاہ جی نے سادہ کپڑے کی گول ٹوپی پہن رکھی تھی۔ گلے میں رنگین قمیص، قمیص کی آستین صرف بازوؤں تک، پاؤں میں چپل ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا، رات کو میں اسٹیج پر مولوی عبدالحنان صاحب کے پاس پڑا سو رہا تھا کہ کسی شخص کی دھواں دار تقریر سے میری آنکھ کھل گئی۔ یہ ہمارے شاہ جی تھے جو انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تقریر کر رہے تھے صبح ڈاکٹر عبدالقوی صاحب کے یہاں ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی مجھے اس دن بخار تھا، ابا جی نے منع کیا کہ صرف چائے پی لینا، مگر شاہ جی انڈے چھیل چھیل کر میری طرف بڑھاتے رہے اور میں کھاتا گیا، شاہ جی سے اس پہلی ملاقات کے بعد خلاف عادت میں بہت متاثر ہوا، یقین جانئے کہ کئی برس تک اس بچپن کے عالم میں میرا یہ حال رہا کہ بالکل شاہ جی کی طرح چپل پہنتا رہا، ایسی ہی ٹوپی اوڑھتا ایسا ہی موٹا سا ڈنڈا لئے پھرتا اور جمعہ اسلامیہ ڈابھیل کی مسجد میں سیکڑوں دفعہ طلباء کو گھیر گھار، ان کے سامنے شاہ جی کے لب و لہجہ میں اول خول تقریریں بکا کرتا۔

شاہ جی سے مجھے محبت زائد اس وجہ سے ہوئی کہ میرے والد مرحوم فطرۃً بہت خاموش، دنیاداری سے بالکل الگ ملنے ملانے سے نفور اور تعلقات میں ایک زبردست معیار کے انسان تھے۔ بڑے سے بڑے انسان کے لئے بھی یہ مشکل تھا کہ وہ ابا جی کو متاثر کر سکتا اور ان سے تعریف و تحسین کے دو کلمے پالیتا۔

۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۲ء میں گاندھی نے میرے والد مرحوم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں گوشہ نشین فقیر "لیڈروں سے ملنے کا سلیقہ نہیں رکھتا"۔

نظام حیدرآباد نے انہیں گھیر گھار کر اپنے یہاں بلایا۔ کہتے ہیں کہ نظام ترجمہ قرآن کے سلسلہ میں ابا جی سے کوئی علمی خدمت لینا چاہتے تھے اور اس کام کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار تھے، مگر ابا جی نے کہا کہ "میں پیسے لے کر قرآن کی کوئی خدمت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا آپ اس کام سے مجھے معذور سمجھیں"، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے غیر ملنسار اور غیر دنیا دار آدمی کا کسی سے متاثر ہونا واقعی مشکل تھا۔ مگر ابا جی، شاہ جی کے جہاں سے دیوانے تھے ہر وقت شاہ جی کا کلمہ پڑھتے ہر وقت انہی کا حال پوچھتے کتاب سے فراغت ہوئی چارپائی پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سادہ چائے آئی اس کا دور

چلا۔ سامنے میرے ماموں جناب حکیم سید محفوظ علی صاحب یا مولانا حفظ الرحمن، مولانا محمد ادریس صاحب، مولانا عتیق الرحمن صاحب عثمانی، ہوئے اور ابا جی نے سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔

"کیوں مولوی صاحب! ہم عطاء اللہ شاہ کو اگر سب کاموں سے ہٹا کر صرف تردید قادیانیت پر لگا دیں تو یہ کیسا رہے گا۔ مولوی صاحب! یہ صاحب واقعی مخلص ہیں بہت محنتی اور بہت زیادہ بہادر، انہوں نے پنجاب میں چند تقریریں کر کے قادیانیت کے خلاف ایک عام جذبہ پیدا کر دیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے اسی طرح محنت سے کام کیا تو قادیانیت انشاء اللہ ختم ہو جائے گی۔"

شاید سیماب کا شعر ہے کہ ؎

خاک پروانہ، رگِ گل، عرقِ شبنم سے
اس نے ترکیب تو سوچی تھی مگر دل نہ بنا

اور واقعہ یہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے جاندار اور دھڑکتا ہوا دل بنا لینا بہت ہی مشکل ہے سائنس کی تجربہ کاریاں اگر متحرک، زندہ اور جاندار دل بنا لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو تخلیق اور آفرینش سے ان کا فاصلہ کچھ دور نہیں رہتا مگر جب قدرت نے خود ارادہ کیا تو اس نے پہاڑوں کی سنگینی، بجلیوں کے زور طوفان کے شور، آندھیوں کی بلاخیزی بادلوں کی گرج درختوں کی بلندی صحرا کی وسعت صبح کی بہار آفرینی شام کی رعنائی راتوں کے سکون، پھولوں کی لطافت کلیوں کی نزاکت، بادِ صبا کی شوخی، آبشاروں کے ترنم اور بہت سی متضاد چیزوں کو جمع کر کے ایک وجود بنایا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اس کا نام رکھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کشمیر سے لے کر راس کماری تک ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر بستی میں چیختا اور چلاتا روتا رلاتا ہنستا بولتا، گرجتا برستا پھرتا رہا شاید ہی کوئی شہر ہو جس کی فضاؤں میں بخاری کی تقریروں کی روانی، ایک پوشیدہ قوت بن کر جاگزیں نہ ہو۔

ہندوستان کے مسلمان بخاری کو بھول جائیں مگر یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں جب کوئی ایک مسلمان کسی پریشانی سے رویا ہے تو عطاء اللہ شاہ کے آنسوؤں نے اس کا ساتھ دیا ہے جب بھی کسی مظلوم نے اسے آواز دی ہے تو وہ سینہ تان کر اس کی حمایت میں سامنے آ گیا ہے، گجرات، ملتان، دہلی، علی پور (بنگال) لاہور، امرتسر، راولپنڈی اور میانوالی کی جیلیں اس کی یادگار ہیں۔ آج نہ سہی ایک وقت ضرور آئے گا جب آنیوالی نسلیں ان جیلوں کو بخاری کی قیام گاہ کی حیثیت سے آثارِ قدیمہ میں شامل کر دیں گی۔

آج تاج محل، محل آرٹ کا ایک نشان اور ہندوستان کی عظمت کا ایک باوقار نمونہ ہے۔ وقت مجبور کرے گا کہ امرتسر اور ملتان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مکانات کو اپنی تاریخ حریت کی یادگار کے طور پر محفوظ کیا جائے۔

لاہور کے ایک جلسہ میں پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے والے ایک مصنف کے خلاف احتجاج کیا جا رہا تھا۔ لاکھوں کے مجمع میں بخاری نے کہا کہ "وہ دیکھو سامنے! خدیجہ الکبریٰ کھڑی شکایت کر رہی ہیں کہ میرے شوہر نامدار کی توہین کی گئی ہے اور لاکھوں مسلمانوں میں سے ایک بھی نہ بولا لو، وہ سنو فاطمہ زہرا فرماتی ہیں کہ میرے باوا جان کی بے عزتی کی گئی ہے اور ان کی امت نے کچھ نہ کیا"، تو لاکھوں کے اس مجمع کی چیخیں نکل گئیں اور سینکڑوں مسلمان عورتوں نے اپنے شیر خوار بچوں کو شاہ کے سامنے پھینک دیا کہ ہم اپنے جگر گوشوں کو ناموس رسالتؐ پر قربان کرتے ہیں۔ کوئی اور بھی اگر ایسا جادو بیان خطیب ہو تو مجھے بتاؤ۔

جن دنوں انجمن خدام الدین کے جلسہ میں ابا جی نے شاہ جی کے ہاتھ پر بیعت کی ان دنوں شاید اخبار انقلاب لاہور میں ایک نظم چھپی تھی جسے اس زمانہ کے مشہور اخبار سیاست نے بھی خوب مزے لے لے کر چھاپا تھا اس کے پہلے چند اشعار میں تو نمک کے محصول کے سلسلہ میں ابا جی کے ایک مشہور فتویٰ کا مذاق اڑایا تھا، اس فتوے کا اس زمانہ میں اس وجہ بہت چرچا ہو گیا تھا کہ گاندھی نے اس فتوے کو سامنے رکھ کر نمک سازی کی اپنی مشہور تحریک شروع کی تھی۔

اس نظم میں ابا جی کی بیعت کا یوں ذکر کیا گیا تھا کہ ؎

کی ہے اک شاگرد کی استاد نے بیعت قبول
بڑھ گیا ہے مہر سے کس درجہ رتبہ ماہ کا
انقلاب آسماں دیکھو کہ اک ادنیٰ مرید
پیر انور شاہ جیسا ہے عطاء اللہ کا

اور بادی النظر میں یہ بات واقعی حیرت انگیز تھی کہ ابا جی، شاہ جی کی بیعت کریں۔ مگر یہاں "میان عاشق و معشوق رمزیست" کا معاملہ تھا، کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا کہ مرید نے مرشد میں کیا جوہر دیکھے اور کیوں اس کے ہاتھ پر بیعت کی ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ شاہ جی کا نام آیا اور ابا جی کے چہرہ پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کسی نے شاہ شاہ جی کی تعریف کی تو خوش ہو گئے کسی نے شاہ جی کو برا کہا تو بگڑ گئے۔

اباجی کو اخبار پڑھنے کی کبھی عادت نہ تھی مگر صرف شاہ جی کی خبریں معلوم کرنے کے لئے اخبار پڑھنے والوں سے جب خیال آجاتا تو پوچھتے کہ بھائی شاہ جی کی خبر ہے ؟ کہیں تقریر کی یا نہیں ؟ کہاں ہیں ؟ ادھر دیوبند کی طرف تو آنے کی خبر نہیں ؟

اللہ اللہ محبت و شفقت کا کیا عالم تھا، ایک دفعہ اسی طرح مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آج اخبار میں شاہ جی کی کوئی خبر تھی کہ نہیں ؟ میں نے جھنجھلا کر کہا کہ کوئی نہیں ؟ فرمایا کہ الجمعیۃ بھی دیکھا تھا یا نہیں ؟ میں نے کہا دیکھا تھا اس میں بھی کوئی خبر نہیں تھی ارشاد ہوا کہ اور زمیندار ؟ میں اس کھود کرید سے تنگ آگیا، ایک کر بولا کہ جی اس میں خبر تھی کہ شاہ جی گرفتار ہوگئے۔ میری آنکھوں کے سامنے اٹھارہ انیس سال پہلے کا یہ نقشہ جوں کا توں موجود ہے، اس طرح کہ گویا یہ واقعہ آج ہی ہوا ہے اباجی چارپائی پر اپنے کھردرے بستر پر لیٹے ہوئے تھے، یہ سنتے ہی اٹھ بیٹھے، گھبرا کر پوچھا کہ گرفتار ہوگئے، کہاں گرفتار ہوگئے ؟ بھائی ! کیا معاملہ ہوا ذرا تفصیل سناؤ، ان کے گھبرا کر اٹھ بیٹھنے اور اس طرح سوالات کرنے سے مجھ کو احساس ہوا کہ میرا یہ جھوٹ اباجی کے لئے بدرجۂ غایت تکلیف دہ ہوگا۔ یہاں تو محض دفع الوقتی کے لئے جھوٹ بولا تھا، مگر اب یہ جھوٹ جان لے کر رہے گا، پریشان ہوا کہ آخر کیا کروں اور دل نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ اس شاندار جھوٹ کو واپس لے لینے ہی میں عافیت ہے۔

میں نے عرض کیا کہ میں تو ویسے ہی مذاق کر رہا تھا، شاہ جی کہیں گرفتار نہیں ہوئے۔ ۱۴ مئی کو دہلی میں جلسہ ہے شاہ جی اس جلسہ میں شرکت کے لئے دہلی آنے والے ہیں۔

بے ساختہ فرمانے لگے کہ نعوذ باللہ جھوٹ کسی ضرورت اور حاجت سے بولا جاتا ہے، آپ کچھ عجیب طرح کے آدمی معلوم ہوتے ہیں، بظاہر یہ جھوٹ بولنے میں آپکا کوئی نفع نہیں تھا مگر آپنے بے ساختہ جھوٹ بولا گویا آپ ضرورتاً نہیں بلکہ عادۃً جھوٹ بولتے ہیں حق تعالیٰ آپ کو ہدایت فرمائے، آپ کو نیک عمل کی توفیق دے، آپکا حال تو ہمارے نزدیک بہت افسوس ناک ہوتا جا رہا ہے۔

شاہ جی ایک دفعہ دیوبند تشریف لائے، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ساتھ تھے اور قیام ہمارے ہی مکان پر تھا میں ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ہم جس مکان میں اب مقیم ہیں اس مکان میں بھی اباجی سات سال تک ہمارے ساتھ رہے، مگر اس سات سال کے عرصہ میں صرف ایک مرتبہ یہ موقع آیا کہ اباجی گھر کے باورچی خانہ میں تشریف لائے، صرف ایک مرتبہ اور یہ موقع وہی تھا جب شاہ جی ہمارے مہمان تھے، اباجی نے باہر سے آتے ہی والدہ کو آواز دی، وہ باورچی خانہ میں تھیں آواز کا جواب نہ دے سکیں۔ جلدی سے اباجی باورچی

خانہ میں تشریف لے آئے، اماں سے فرمانے لگے کہ ارے سنتی ہو! آج ہمارے ایک بہت معزز مہمان آیا ہے، بہت زیادہ معزز، اس کی تواضع اور مہمان داری بہت اچھی طرح کرنی چاہیے ابھی کسی ہمسائے کے یہاں سے ایک دو مرغ منگواؤ، ان کا شوربا پکالو، چاول پکاؤ، کوئی میٹھی چیز بھی پکالو، شام کو بڑے سلیقہ اور فراغت سے مہمان کو کھانا کھلاؤ۔"

آپ لوگوں کے نزدیک یہ کوئی بات نہ ہوگی، کہ ہر شخص اپنے مہمانوں کی تواضع کرتا اور ان کی مدارات کے لیے مختلف اہتمام کرتا ہے مگر اباجی کا معاملہ عام لوگوں سے الگ تھا، ان باتوں اور جھگڑوں سے ان کی بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ میں نے قرآن شریف ناظرہ سے شروع کر کے پورا حفظ کرلیا۔ اور اس میں مجھے دو تین سال لگے، مگر اباجی کو اس ساری مدت میں یہ نہ معلوم ہوا کہ ازہر کیا پڑھتا ہے، جس دن میں قرآن کے حفظ سے فارغ ہوا، اس دن ، مولانا سراج احمد صاحب رشیدی مرحوم نے جو اباجی مرحوم کی مجلس علمی کے ایک ممتاز رکن اور اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے اباجی کو مبارک باد دی۔ فرمانے لگے "یہ تو ہماری توقع اور علم کے بغیر ایسا ہوگیا ہے۔ ہمیں اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ ازہر حفظ کر رہا ہے اور حفظ بھی اب ختم ہوگیا ہے"۔ آپ اندازہ کیجیے کہ جس شخص کو دنیا داری سے اتنی بے تعلقی ہو، شاہ جی کے حال پر اس کا یہ التفات، یہ محبت اور یہ توجہ قابل ذکر چیز ہے یا نہیں؟

شاہ جی کا تعارف اباجی سے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کرایا تھا، وہی اس آزاد منش، رند پارسا کو گھیر گھار کر اباجی کے پاس لائے اور پھر مدت العمر دونوں ان کی بارگاہ میں مقبول رہے۔

قادیانیت کے سلسلہ میں شاہ جی نے جتنا کام کیا سب اباجی کے اشارہ وارشاد پر، شاہ جی کی تقریریں پسند کی جاتیں تو اباجی کا سیروں خون بڑھتا۔ وہ تردید قادیانیت کے لیے لمبے لمبے دورے کرتے تو اباجی کی نگاہ ان کے ہر قدم پر رہتی۔ ڈابھیل میں مسجد مدرسہ میں ان کا معمول تھا کہ جمعہ کو تقریر فرمایا کرتے، ایسی تقریر جس میں صرف مغز مغز ہوتا تھا، الفاظ بالکل نہیں، نہ کوئی ابتداء ہوتی تھی اور نہ انتہا، تقریر ختم کر چکے مجمع اٹھ گیا، خود منبر سے اتر آئے مگر کوئی بات پھر ذہن میں آگئی تو دوبارہ پھر منبر پر جا بیٹھے اور تقریر شروع فرمادی۔ ایک دن خطبہ مسنونہ کے بعد صرف یہی مضمون بیان ہوا کہ پنجاب میں ایک صاحب ہمیں مل گئے ہیں، صاحبِ توفیق صاحبِ صلاحیت صاحبِ سواد خوب کام کرتے ہیں، مولویوں کی طرح نہ خواہش زر میں مبتلا ہیں اور نہ خواہش شہرت میں بس بے چارہ محض اللہ کے لیے کام کیے جاتے ہیں۔ ہم نے قادیانیت کے متعلق انہیں توجہ دلائی کہ یہ فتنۂ عظیم صحیح اسلام کو جڑ سمیت اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کر بیٹھا ہے، آپ کیوں نہ اس فتنہ کے خلاف کچھ کام کر گزریں۔ آپ کا وہ کام دین میں —— آپ کے لیے نفع رساں ہوگا۔ اور دنیا میں اس سے اہل دین کو فائدہ پہنچے گا۔ یہ کہہ کر پھر شاہ جی کا نام لیا۔ فرمایا کہ بڑوں سے جو کام نہ ہوا وہ اس غریب نے کر دکھایا (طلبہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) آپ تو مدرسہ کی

روٹیاں کھاکر ہر وقت بحث و مباحثہ میں لگے رہتے دین کی کوئی محبت آپ حضرات کے دل میں نہیں عطاء اللہ شاہ اگر یہاں آگئے تو آپ ان سے ملئے وہ عجیب آدمی ہیں۔

میرے خیال میں اباجی کے انہی الفاظ کو سامنے رکھ کر حفیظ جالندھری نے ایک دفعہ کہا تھا کہ دورِ اوّل کے مجاہدینِ اسلام کے گروہ سے ایک سپاہی راستہ بھول کر اس زمانہ میں آنکلا ہے وہی سادگی، مشقت پسندی یکسر عمل خلاص اور للّٰہیت جو ان میں تھی وہ عطاء اللہ شاہ میں بھی ہے۔

ڈابھیل میں فیض اللہ بنّوری کے نام سے ایک طالب علم تھے اباجی کے یہاں ان کی رسائی صرف اس وجہ سے تھی کہ وہ شاہ جی کی شان میں اپنی اٹل اور بے جوڑ نظمیں بڑے بے ہنگم لہجہ میں پڑھ کر سناتے تھے اباجی ہمیشہ اس طالب علم پر توجہ کرتے اس کی مدارت فرماتے اور ہر جگہ اسے یاد رکھتے۔

یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا۔

ابھی چند دن ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی دہلی سے آئے شام کو مغرب کے بعد وہ ان کے دونوں صاحبزادے سعید اور محمدؐ اور میں اباجی کے مزار پر گئے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اباجی اپنے گوشۂ مزار سے مولانا حبیب الرحمٰن کے سلام کا جواب دیں، قبر شق ہوجائے اور اندر سے وقار و سنجیدگی کا وہی حسین پیکر باہر آکر کھڑا ہوجائے جسے دیکھنے کے لئے دور دراز سے لوگ آتے تھے، وہی سبز رنگ کا عمامہ، سبز رنگ کا چوغہ سیاہ غلافی آنکھیں اور خوبصورت چہرہ نظر آجائے۔ جسے اپنے ہاتھوں سے ان کے ہزاروں شاگردوں نے شام کی تاریکیوں میں یہاں دفن کر دیا تھا، فاتحہ پڑھ چکنے کے بعد میں دیر تک ان کی قبر پر مٹکی باندھے کھڑا رہا میرے تحت الشعور میں یہی خیال قائم تھا کہ اباجی اب اٹھے اور اب اٹھے مگر ہائے ؎ سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں۔

رات بڑھتی آئی اندھیرا گہرا ہوتا چلا گیا قبرستان میں اداسیاں پھیل گئیں۔ درخت زور زور سے ہلنے لگے ہواؤں کی سنسناہٹ دل کو توڑے لیتی تھی۔ تاریکی اور اندھیرا سرکش جنات کی طرح سر چڑھے جاتے تھے۔ قبرستان کے کسی گوشے سے کسی طالب علم کی تلاوت کی آواز آرہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ باہر نکلا توعیدگاہ کی دوسری طرف سے ہرٹ چلنے کی آواز خاموشی اور سکون کے سینے کو چیرتی اور رات کی تاریکیوں سے لڑتی جھگڑتی آگے بڑھ رہی تھی ہرٹ کی آواز میں کیا کیفیت ہوسکتی ہے؟ نہ خوشی اور مسرت کا نغمہ اور نہ رنج و غم کی دلدوز داستان، مگر میرے دل سے اُٹھتے ہوئے رنج و غم کے شعلے، ہرٹ کے آواز میں جذب ہوگئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے دل کو کسی نے تھام لیا، میرا سانس ٹوٹا جارہا تھا اسے کسی نے سنبھال لیا، میری روح نکلی جارہی تھی۔ وہ اپنی جگہ تھم گئی۔

جن بزرگوں کے یہ قصے ہیں وہ بزرگ اب مدت ہوئی نظروں سے ایک جلوۂ بے قرار کی طرح اوجھل ہو گئے زمانہ بدل گیا مجلسوں کا رنگ کچھ اور ہے بحث و مباحثہ اور فکر و نظر کا موضع یکسر جدید ہے پچھلی باتوں میں نئے زمانہ کے لیے کوئی دلچسپی نہیں وہ بزرگ اپنے اپنے وقت پر علم و فضل کے آفتاب و مہتاب بن کر چمکے مگر آج تو خاکِ مزار کے سوا ان کا کوئی نشان نہیں ملتا، پہلے کبھی اباجی کی مجلس میں حقائق دین کی گرہیں کھلتیں اور فکر و نظر کے نئے سانچے تیار ہوتے تھے، جن پر ان کی نظر پڑ جاتی تھی۔ وہی کام کا آدمی بن جاتا تھا، جو قدموں میں آ کر بیٹھتا تھا وہی کچھ لے کر جاتا تھا مگر آج ان کے مزار پر خاموشی اور سکون کے سوا اور کیا ہے۔

۷۱ سال کی عمر پوری کر کے شاہ جی نے ۲۱ اگست کی شام کو جانِ جان آفریں کے سپرد کی اور ۲۲ کو بعد ظہر تقریر و خطابت کے اس بادشاہ کو منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا، شاہ کی موت پر ایک تاریخ ختم ہو گئی ایک عہد گزر گیا، ایک دور پورا ہو گیا، ایک چمن اجڑ گیا، ایک بہار لٹ گئی، تقریر و خطابت کی رونق ختم ہو گئی۔ جرأت و شجاعت کا شیرازہ بکھر گیا اور خلوص و دیانت پر افسردگی چھا گئی، اب نہ کبھی شاہ نظر آئیں گے نہ انکی تقریریں سننے کا موقع ملے گا، لیکن جب بادل گرجے گا، بجلی چمکے گی، موسلا دھار بارش ہو گی، طوفان اور سیلاب آئینگے۔ جب کبھی صبح ہو گی اور جب کبھی شام آئے گی۔ جب کبھی پھول کھلیں گے اور کلیاں مسکرائیں گی، جب کبھی باد صبا پھولوں اور کلیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی چمن سے گذرے گی جب کبھی کوئی قرآن پڑھے گا۔ اور جب کوئی رات کی آخری اور خنک ساعتوں میں لاکھوں اور ہزاروں کے مجمع کے سامنے تقریر کرے گا۔ جب کوئی جرم حق گوئی کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتوں سے گذرے گا۔ جب کوئی مرد حق اللہ اور اس کے رسولؐ کی عظمت کے لئے اپنے جسم و جان کا نذرانہ وقت کے کسی ظالم اور قاہر کے سامنے پیش کرے گا۔ مجھے اس وقت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ضرور یاد آئیں گے کہ ان سب چیزوں میں مجھے عطاء اللہ شاہ بخاری کی شباہت ملے گی۔ عطاء اللہ شاہ کی کچھ ادھوری سی نقل، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی رسالہ مجاہدانہ اور سحر آفریں زندگی اس کے خلوص و دیانت اس کی تقریر و شعلہ بیانی ان کی عظیم الشان شخصیت ان کی طویل قومی خدمات ان کی بے غرضی بے نفسی اور بے ریائی اس کی حسین جوانی اس کے پر وقار بڑھاپے کو اس کے لاکھوں عقیدت مندوں اور دور افتادہ از ہر کا سلام۔

رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَاسِعَةً وَغَفَرَلَهُ اللّٰهُ مَغْفِرَةً كَامِلَةً

اِک بار تو لوٹ آ کہ مصائب کا سماں ہے

شورش کاشمیری

دل درد میں ڈوبا ہے زباں نوحہ کناں ہے
ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں بخاری تو کہاں ہے

اے خطۂ فردوس کے رہی تو پلٹ آ
رحلت پہ تری غلغلۂ آہ و فغاں ہے

آواز تو دے خانہ خرابانِ وفا کو
اک بار تو لوٹ آ کہ مصائب کا سماں ہے

کس حال میں ہیں پیشِ رسانِ عدم آباد
معلوم تو ہوگا تجھے اب کون کہاں ہے؟

ہیں نوکِ زباں قاسم و محمود کی باتیں
ان میں بھی کبھی تذکرۂ ہم نفساں ہے؟

ہم نے تو جلائے ہیں چراغ اپنے لہو سے
لیکن یہ جہاں کارگہِ شیشہ گراں ہے

یہ کون اُٹھا محفلِ ہستی سے عزیزو؟
خورشیدِ جہاں تاب بھی خونابہ فشاں ہے

"جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا کوئی اور نشاں ہے

اس عقدۂ پر پیچ پہ مغموم ہوں شورش
کیا چیز یہاں کشمکشِ عمرِ رواں ہے

رواں رہے گا یونہی کارواں بخاریؒ کا

سید امین گیلانی

سکونِ زیست کی دولت لٹا کے بیٹھ گئے
ہم ایک گوہرِ یکتا گنوا کے بیٹھ گئے

وہ جب سے چہرۂ انور چھپا کے بیٹھ گئے
ہم اپنی پلکوں پہ شمعیں جلا کے بیٹھ گئے

ترس رہی ہیں نگاہیں تمہاری صورت کو
اب آ بھی جاؤ کہ سب لوگ آ کے بیٹھ گئے

قریب کر کے محبت سے ایک دنیا کو
عجیب بات ہے خود دُور جا کے بیٹھ گئے

وفا شعار تھے تم کیا ہوا خُدا کے لئے
کہ اپنے یاروں سے دامن چھڑا کے بیٹھ گئے

ہمارا جی نہیں لگتا کہیں تمہارے بغیر
مگر ہو تم، کہ کہیں جی لگا کے بیٹھ گئے

زمیں پہ پھولوں میں کم ہو گئی تھی بُوئے وفا
کہ اب فلک پہ ستاروں میں جا کے بیٹھ گئے

رواں رہے گا یونہی کارواں بخاریؒ کا
عدو نہ سمجھیں کہ ہم دل بجھا کے بیٹھ گئے

تڑپ کے چاکِ گریباں کریں گے باطل کا
وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم چوٹ کھا کے بیٹھ گئے

جناب احمد ندیم قاسمی

عظیم کردار

زیرِ نظر مضمون محترم جناب احمد ندیم قاسمی نے گزشتہ سال تحریر کیا تھا جسے ہمارے رفیقِ فکر جناب اختر جنجوعہ نے اُن سے حاصل کر کے "نقیبِ ختمِ نبوت" کی خصوصی اشاعت کے لئے ہدیۂ قارئین کیا ہے۔ "ادارہ"

محترم سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم و مغفور مسلمانوں کی تحریکِ آزادی اور ان کے دینی شعور کی تاریخ کے ایک ایسے عظیم کردار تھے کہ محض بطور مثال اگر اس ایک کردار سے صرفِ نظر کر لیا جائے تو پوری تاریخ کی عمارت ڈولنے لگتی ہے۔ دراصل ہم عجیب و غریب ذاتی اور گروہی تعصبات میں مبتلا لوگ ہیں چنانچہ اپنی تاریخ ساز شخصیتوں کو بھی اپنی تعصبات کے محدود دائروں میں رکھ کر پرکھتے ہیں اور اثبات کی بجائے نفی سے بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ ہماری یہ ذہنیت ہمارا بہت بڑا المیہ ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ہمہ گیر شخصیت کے ساتھ بھی ہم نے کچھ ایسا ہی رویہ روا رکھا ہے۔ ورنہ اپنے ہم وطنوں، خصوصاً مسلمان ہم وطنوں کے ذہنوں میں انہوں نے برطانوی استعمار و استبداد کے خلاف جو غیر مشروط نفرت پیدا کی اور مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی حریت پسندانہ روایات کی جو مشعلیں انہوں نے روشن کیں وہ ہماری سیاست اور ہمارے دین و دانش کی وہ اقدار ہیں جنہوں نے ہماری شخصیتیں تعمیر کی ہیں اور ہمارے جذبوں اور امنگوں کی تربیت اور تہذیب کی ہے۔

تحریکِ پاکستان کا ساتھ نہ دینے والوں میں سے شاہ جی واحد شخصیت تھے جنہوں نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اپنی رائے کی شکست کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کر لیا۔ حق بات یہ ہے کہ اس طرح کے تاریخی اعترافات عظیم لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ ورنہ دوسرے حضرات تو اپنے سابقہ طرزِ عمل کی تاویلیں ہی کرتے رہ جاتے ہیں اور نظریہ پاکستان کے دورِ حاضر کے ٹھیکیداروں

طریق کار اب تک یہی ہے کہ تاویل کرتے ہیں اور تاویل نہ کر سکیں تو اپنی کتابوں میں سے پاکستان کی مخالفت میں کہے گئے جملے حذف فرما دیتے ہیں۔

میری حیثیت ان کے ایک ادنیٰ عقیدت مند کی ہے۔ ۱۹۳۷ء کے آس پاس کا ذکر ہے میں بہاول پور کے کالج میں طالب علم تھا۔ خبر گرم ہوئی کہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نماز عشاء کے بعد مسجد جامع میں تقریر فرمائیں گے۔ طلبہ نے شاہ جی کی ساحرانہ خطابت کے قصے سن رکھے تھے چنانچہ ہم لوگ مسجد جامع پہنچے اور زندگی میں پہلی بار شاہ جی کی خطابت کے اعجاز سے متعارف ہوئے میں نے اس عمر میں ایسی مؤثر تقریر تو کیا سنی ہوگی، ایسی مؤثر تحریر بھی نہیں پڑھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ کا ایک لشکر ان کے سامنے دست بستہ حاضر ہے اور وہ ہر دلیل، ہر نکتے، ہر جذبے کے لئے ایسے مناسب الفاظ استعمال فرما رہے ہیں کہ بلاغت کے اصولوں کے مطابق اس سے زیادہ مناسب الفاظ کا تصور تک محال ہے۔ اس پر مستزاد ان کا انتخاب اشعار تھا کہ معلوم ہوتا تھا یہ شعر خاص اسی صورت حال کے لئے شاعر کے دل پر وارد ہوا تھا۔ آیات قرآنی کی قرأت کا انداز بھی منفرد تھا اور اشعار بھی وہ ایسے لحن سے ادا فرماتے تھے کہ خود شاعر بھی اپنا شعر شاہ جی کے لحن میں سنتا تو پکار اٹھتا کہ میرے شعر کو تخلیق کے بعد آج فن کی معراج نصیب ہوئی۔ شاہ جی کی یہ تقریر نصف شب کے بعد تک جاری رہی۔ پھر اچانک انہوں نے گھڑی دیکھی اور ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے یہ دعا بجائے خود فصاحت و بلاغت کا ایک شاہکار تھی۔ دوران دعا کسی نے عرض کیا کہ بارش کی بھی دعا فرمائیے۔ شاہ جی نے موسلا دھار بارش کی دعا مانگی اور ابھی وہ بارش کی یہ دعا ختم نہیں کر پائے تھے کہ مجمعے میں سے کسی کی آواز آئی۔ "قبلہ شاہ جی، ہمیں اتنی زیادہ بارش نہیں چاہیئے، ہم غریبوں کے گھر کچے ہیں"! شاہ جی نے یہ سنا تو دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ گرا دیئے اور اسلام میں اعتدال اور میانہ روی کے موضوع پر نئی تقریر کا سلسلہ شروع ہوا جو نماز فجر کی اذان تک جاری رہا اور اس تمام عرصے میں لوگ جوق در جوق آتے تو رہے لیکن اٹھ کر گیا ایک بھی نہیں اور جاتے بھی کیسے سب شاہ جی کی تقریر کی ساحرانہ گرفت میں تھے۔

اس کے بعد مجھے لاہور میں بیرون دلی دروازہ شاہ جی کی متعدد تقریریں سننے کا شرف حاصل ہوا اور جو بھی تقریر سنی، سابقہ تقریروں کے مقابلے میں بالکل نئی اور زیادہ مؤثر محسوس ہوئی۔

آج ان تقریروں کو یاد کرتا ہوں تو اپنا ہی ایک شعر میرے ذہن میں گونجنے لگتا ہے ؎

جب بھی دیکھا ہے تجھے، عالم نَو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

میں نے بالمشافہ شناسائی کا یہ مرحلہ بھی طے کرنا چاہا اور ایک بار ملتان میں ان کی خدمت میں حاضر بھی ہوا مگر جس شفقت سے شاہ جی نے میری پذیرائی فرمائی اور جس محبت سے انہوں نے مجھے سینے سے لگایا اور پھر جس عالی ظرفی سے انہوں نے مجھے خود میرے ہی اشعار یوں سنانے شروع کئے کہ آبدیدہ بھی ہو جاتے تھے، داد بھی دیتے جاتے تھے اور میرے حق میں دُعا بھی فرماتے جاتے تھے، تو مجھے محسوس ہوا کہ شاہ جی تو مجھ سے مدتوں سے متعارف ہیں اور اپنے فن کے بارے میں خود مجھے اتنی معلومات حاصل نہیں جتنی ہماری تاریخ کی اس عظیم شخصیت کو حاصل ہیں۔ دراصل یہ بالواسطہ اظہار تھا اس حقیقت کا کہ ہمارے بڑے جب اپنے سے بہت چھوٹوں کو بھی بڑا بنا کر پیش کرتے ہیں تو یہ ان بڑوں کی فراخ دلی اور وسیع النظری بھی ہوتی ہے اور جوہر قابل کی حوصلہ افزائی بھی کہ یہ سلسلہ رُک نہ جائے، آگے بڑھتا جائے۔ میں نے اپنے ارباب سیاست اور زعمائے دین میں شاہ جی سے بڑا شعر شناس کبھی نہیں دیکھا۔ اچھا شعر ان کے دل میں تازہ ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ سعدیؒ حافظ اور غالب واقبال کے اشعار کو اپنی معجزہ کار تقریروں کی زینت بناتے تھے، وہیں ہم لوگوں کے اشعار کو یہ عزت بخشنے سے گریز نہیں فرماتے تھے۔ حالانکہ جب ہمیں یہ عزت دی گئی، تب ہماری حیثیت نومشق نوجوانوں سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ شاہ جی کی بھرپور اور ہمہ اثر شخصیت کا ایک ایسا پہلو ہے جو انہیں ہماری دینی اور سیاسی تحریکوں کے علاوہ ہماری تہذیبی نشاۃ الثانیہ کا بھی ایک حامل کردار ثابت کرتا ہے۔

رحیم یار خان میں "نقیب ختم نبوت" اور عالمی مجلس احرار اسلام کا دیگر لٹریچر ہم سے حاصل کریں

ابومعاویہ حافظ محمد صدیق قمر متصل مدرسہ جامعہ فاروقیہ رحیم یار خان عثمان پارک فون ۴۹۱۵

لاہور میں "نقیب ختم نبوت" کا تازہ شمارہ ہم سے حاصل کیجیے!

چودھری بک ڈپو
اتحاد کالونی، مغل پورہ، لاہور

عبد اللطیف خالد چیمہ
مرکزی سیکرٹری اطلاعات عالمی مجلس احرار اسلام پاکستان

شاہ جی کا مشن اور ہماری ذمّہ داری

۲۱ اگست (۱۹۶۱ء) کو بانی احرار حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو ہم سے رخصت ہوئے بائیس برس ہو چکے ہیں۔ یہی سال صدیوں میں بدل جائیں گے لیکن اب وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

شاہ جی مرحوم خود ہی فرمایا کرتے تھے!

"میں وہاں چلا جاؤں گا۔ جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔ پھر تم مجھے پکارو گے۔ لیکن تمہاری پکار تمہارے کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر تمہیں ہلکان کر دے گی مگر تم مجھے نہ پاؤ گے"۔

شاہ جی زمانے کی بے راہروی اور اپنوں کی منافقانہ چالوں سے روٹھ کر گئے۔ شاہ جی مرحوم نے جو محفل سجائی تھی۔ اس کی لَو میں اپنوں اور بیگانوں کی ہزارہا مخالفت کے باوجود کمی نہیں آئی (الحمدللہ) اور آج بھی اس گئے گزرے دَور میں فرزندانِ امیر شریعت کی زیر قیادت قافلۂ احرار اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اور شاہ جی کے ان الفاظ پر عمل پیرا ہے کہ

"خواہ ساری دنیا مجھے چھوڑ جائے مگر میں مجلس احرار اسلام کے علَم کو بلند رکھوں گا"

احرار ساتھیو! وقت کی نگاہیں لاکھ خون آلود ہو جائیں۔ اپنوں کی مسلسل بیگانگی کو مدّ نظر نہ رکھتے ہوئے "ختم نبوت" کے تحفظ کے لئے پہاڑوں کی بلندیوں اور سمندر کی گہرائیوں کی خاطر میں نہ لاتے ہوئے حضرت امیر شریعت مرحوم کی روح کو تسکین پہنچانے کے لئے آگے بڑھتے جائیے! اور ملک میں اسلامی نظام حیات کے نفاذ کے خلاف اٹھنے والے اور ملّت کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے والے صوبائی عصبیت کے سیلاب کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جانا ہی تمہارے لئے لطفِ زلیست ہے۔ آج شاہ جی مرحوم کی عدم موجودگی میں رضا کارانِ احرار کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ بات زبانِ زدِ خاص و عام کر دیں کہ زندگی صرف پھولوں کی سیج ہی نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر بھی ہے اور ملک و قوم کے نام پر بازی گر بن کر زرگری کے کھیل کھیلنا سب سے بڑی لعنت ہے۔

آیئے ! اور پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اُٹھیئے، تجدید عہد کیجئے کہ جب تک اس ملک میں صحیح اسلامی نظام کا نفاذ نہ کرلیں گے۔ اس وقت تک ہماری زندگیاں ہم پر حرام ہیں ۔ اگر پاکستان اسلامی نظامِ حیات سے ہم کنار نہ ہوا تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو تباہی سے بچا نہیں سکتی ۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا، پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا !

اعترافِ عظمت

آج دُنیا ترستی ہے

میں نے اپنی اسی سالہ زندگی میں درجنوں بڑے بڑے خطیبوں کو سُنا لیکن حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری کا مثیل نہ دیکھا نہ سُنا۔ وہ آیات یا اشعار پڑھتے تو فضا جھوم اٹھتی ۔ وہ متبحر عالم بھی تھے اور شگفتہ مزاج ادیب بھی، وہ دلچسپ حکایات سے دلچسپ نتائج اخذ کرتے تھے اور علمی نکات اور لطائف کے امتزاج سے خطابت میں انتہا درجہ کی تازگی و شگفتگی بھر دیتے تھے۔ ان کی ساری زندگی لوگوں کو اللہ کی طرف بُلاتے اور مرزائیوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد میں بسر ہوئی۔ تزکیہ نفس اور مرزائیت آپ کے خاص موضوع تھے ۔ آج دنیا اس سلاست ، حلاوت اور فصاحت کو ترس رہی ہے جو شاہ جی دنیا میں تقسیم کیا کرتے تھے ۔ (ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم ۔ "میری داستانِ حیات")

صدائے مجذوب (سیدنا حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ)

زلفیں ہوں گی شانے ہوں گے کہیں کہیں افسانے ہوں گے
دین اور مذہب کے مرقد پر شمعیں اور پروانے ہوں گے

سید محمد ذوالکفل بخاری

روشن ستارہ

آسمان کی کھیتی اپنی بے کراں وسعتوں میں لہلہاتی، جھلملاتے تاروں کی فصل کے انگ انگ سے پھوٹتے ہوئے شباب نور سے حظ اٹھانے میں غلطاں تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور میں صحن میں بیٹھا آسمان کی قبائے نیلگوں سے پھوٹ پھوٹ کر آنے والے ستاروں کی روپہلی روشنی اور چاند کی کیف آور چاندنی کے سنگم سے فضا پر طاری نورانیت کے طفیل ایک روشن روغن ورق پر، اپنے دیرینہ رفیق، اپنے قلم کی رفاقت میں دل و نگاہ کی مسلمانی کے ایک آفاقی مبلغ کی یادوں بھری باتوں اور باتوں بھری یادوں کو رقم کرنے میں مصروف تھا کہ نہ معلوم کب نندیا پور کے ہرکاروں نے مجھے اغوا کر لیا۔

اچانک کسی نے میرے قریب آکر کہا بیٹا! صبح ۱۲ اگست ہے نا! آواز کی شفقت و ملائمت اور لہجے کا شکوہ، میرے رگ و پے میں عقیدت و احترام کا رس گھولتا چلا گیا۔ میں نے پلٹ کر کہنے والے کو دیکھنا چاہا، مگر نگاہیں اُس پیکر نورانی کے جلوے کی تاب نہ لا سکیں تو ریاض خیر آبادی نے بر وقت مدد کی۔

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں　　یہ آدمی ہے مگر، دیکھنے کی تاب نہیں۔

میں نے جھکے ہوئے سر کو ذرا اوپر کیا اور کہا ہاں! بابا جی، صبح ۱۲ اگست ہی ہے۔ مگر آپ .... میرا سوال ابھی تشنۂ تکمیل تھا کہ اُس نے جواب دیا کہ ہاں ہاں میں یہ بھی بتاؤں گا کہ ۱۲ اگست سے میرا کیا تعلق ہے؟ پہلے یہ بتاؤ کہ صبح تم کیا کرو گے؟ اور یہ رات گئے تک بیدار کیوں رہے ہو؟ میں نے عرض کی کہ حضرت! صبح میرے دیس کے ایک بطل جلیل کا یوم وفات ہے جس نے نصف صدی تک میری قوم میں حرارت ایمانی کی دولت نایاب کو بے دریغ تقسیم کیا اور جو ...... میں کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا کہ بزرگ پھر بولے اچھا، تو تم اُس شخص پر مضمون لکھو گے؟ اور کسی مجمع میں داد پانے کے لئے اپنے مضمون کو بڑے خطیبانہ ڈھنگ سے سنا ڈالو گے؟ میرے چہرے کے تاثرات ...... سے اثبات

میں جواب پاکر اُس نے کہا کہ مجھے سناؤ گے؟ جو تم نے لکھا ہے! اور — میں عہدِ حاضر کے ہر قلم کار کی طرح جو اپنی تخلیقات کسی کسی کو سنانے کے لئے باؤلا سا پھرا کرتا ہے، فوراً راضی ہو گیا۔ پھر میں نے کہنا شروع کیا کہ

"تواریخ انقلاباتِ عالم اس بات کی عظیم الشان شاہد ہیں کہ جب بھی کسی معاشرے میں اس کی تمدنی، تاریخی ثقافتی اور تہذیبی حقیقتوں سے کنارہ کشی کا رجحان بڑھنے لگے تو اس معاشرے کا ارتقا لازماً موقوف ہو جاتا ہے اور پھر جوں جوں قوم کے اس روش پر چل نکلنے کے عمل میں تیزی آتی ہے تو اس قوم کے من حیث المجموع زوال کی وادیٔ ظلمت کی طرف بڑھتے ہوئے قدم بھی اسی سرعت و شدت کے ساتھ اُس قوم کو اس کے انجام سے ملا دینے کے لئے رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ اور پھر بالآخر دیکھتی آنکھیں اور سوچتے ذہن اس انجام کو حقیقت ماننے پر مجبور ہوتے ہیں مگر ایک اضطراب کے ساتھ! لیکن پھر وہی انجام ایک آغاز کو جنم دیتا ہے۔ یہ آغاز دراصل اُسی اضطراب کا نقشِ اوّل ہوتا ہے۔ اور یہ سب کچھ پلک جھپکنے میں نہیں ہو جاتا کہ جیسے مفکر کے فکر، مصنف کی تصنیف، مؤلف کی تالیف، خطیب کے خطاب، شاعر کے اشعار، مغنی کے نغمے، مجذوب کی بڑ، فقیر کی صدا، سخن ور کے تخیل یا ادیب کے ادب پاروں میں سمویا یا پایا جا سکے بلکہ اس کی تفہیم و تشریح کے لئے ایک مطالعاتی و مشاہداتی سفر درکار ہوتا ہے۔ یہ سفر جو قوموں کے خوابیدہ دل و دماغ میں انقلاب کی نیو رکھتا ہے۔ یہ سفر صدیوں پر محیط بھی ہو سکتا ہے اور برسوں میں منتج بھی۔ یہ سفر دلچسپ بھی ہوتا ہے اور کٹھن بھی۔ امید و نومیدی، آس و یاس اور جانکنی و جاں نثاری اس سفر ہی کی کیفیات ہیں۔ دورانِ سفر کچھ مرحلے ایسے بھی آتے ہیں کہ جب ولولے وسوسوں کی نذر ہو جاتے ہیں اور کبھی خدشات و موانعات حوصلوں کے مقابل ہیچ نظر آنے لگتے ہیں۔ اور پھر ایسے میں خلاقِ اعظم و ربِ کائنات کوئی روشن ستارہ انسانی پیکر کی صورت میں وہاں وارد کرتا ہے۔ جو ان میں خودی اور خود آگہی کا بیج بوتا ہے اور جو اپنے خون سے، ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے پروا ہو کر اس بیج کی آبیاری کرتا ہے۔ تب — وہ ہمہ انتظار بن جاتا ہے اُن لمحوں کے لئے کہ جس میں یہ مژدۂ جانفزا اس کے دل و دماغ کی پنہائیوں اور روح کی گہرائیوں تک میں سرشاری کی ہریں دوڑانے لگے کہ اس کی قافلہ سالاری میں بڑھنے والا قافلہ خودی اور خود آگاہی کا جوہر، اپنا زاویۂ فکر و نظر اور صدائے قلب و جگر بنا چکا ہے اور آج اس قافلہ کا اپنا تشخص، اس کا ایمان اور اس کی پہچان ہے اور قافلہ والوں کو اپنی پہچان عزیز از جان ہے۔ تو اس کی آنکھوں میں بہجت و انبساط اور مسرت و اطمینان چھلکا پڑتا ہے۔ واقعی! بڑی خوش بختی کے غماز ہوتے ہیں وہ لمحات! اور اگر۔۔۔" میں کچھ اور کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ بزرگ نے عجیب بے نیازانہ لہجے میں نعرۂ پُر آواز بلند دھراتے ہوئے پھر میرے سلسلۂ کلام کو منقطع کر دیا۔

ع گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا۔

ویسے میں جب بزرگ کو مضمون سنا رہا تھا تو بزرگ کے چہرے کی کیفیات بھی میری توجہ کا مرکز رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر کبھی جلال کی سرخی دوڑنے لگتی تو کبھی چہرہ بالکل سپاٹ مگر جمالیاتی شاہکار بن کر رہ جاتا۔ کبھی پیشانی پر کوئی متفکر سی شکن نمودار ہوتی تو دوسرے ہی لمحے ایک دلنواز تبسم میں ڈھل کر اس کے ہونٹوں پر رقصاں ہو جاتی۔ میں جو اب تک سوچنے، سمجھنے اور کہہ لینے سے عاری، صرف بزرگ کی شخصیت میں کھو کر محسوسات کا پیکر بن کر رہ گیا تھا۔ آخر بول اٹھا کہ

"اے بزرگِ عالی مرتبت! میں آپ سے تعارف کا خواہش مند ہوں، خدارا اس التجا کو ٹھکرایئے گا نہیں" یہ سننا تھا کہ معاً اس کی کیفیت بدل گئی۔ مجھے ایک بھرپور نگاہ سے نوازتے ہوئے اچانک اس نے نگاہیں ہٹائیں اور ایکا ایکی قلندرانہ لے میں بولنا شروع کر دیا۔

"چالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا، پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہ تھا کہ اُنکی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے۔ غاروں سے ہم کلام ہوتا تو جھوم اُٹھتے۔ چٹانوں کو جھنجھوڑتا تو چلنے لگتیں۔ سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کیلئے طوفان بکنار ہو جاتے۔ درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے۔ کنکریوں سے کہتا تو وہ لبیک کہہ اُٹھتیں۔ صرصر سے گویا ہوتا تو صبا ہو جاتی۔ دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں بڑے بڑے شگاف پڑ جاتے۔ جنگل لہرانے لگتے۔ صحرا سرسبز ہو جاتے۔ افسوس میں نے اُن لوگوں میں معروفات کا بیج بویا جن کی زمینیں ہمیشہ کے لئے بنجر ہو چکی تھیں جن کے ضمیر قتل ہو چکے تھے، جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط تھا۔ جن کی بستیاں انتہائی خطرناک تھیں جو برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ جن میں ٹھہرنا المناک اور جن سے گذر جانا طربناک تھا۔ جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت تھا جو صرف طاقت کی پوجا کرتے تھے۔ تیرہ سو برس کی تاریخ انہی حادثوں کی کہانی ہے۔ انہی چھچھورے، ناسمجھ اور متحرک جانوروں کو دیکھ کر زرتشت نے کہا تھا کہ "اس کا آنسوؤں اور گیتوں کی طرف میلان ہوتا ہے۔ یہاں امرا مدوزخ کے کتّے اور سیاستدان کھٹّے ہیں۔ ان کے سامنے نٹ اور اُنکے پیچھے لاشیں چلتی ہیں۔ اُنکی واحد خوبی یہ ہے کہ ہر نیکی اور برائی کی زبان میں جھوٹ بول لیتے ہیں"۔ بیٹا! ڈھونڈ سکتے ہو تو ان افکار میں میری سوانح عمری کی بنیادیں اور میرا تعارف ڈھونڈ لو۔" اور پھر اس نے ایک کربناک مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور کہا "ہاں سنو ۲۱ اگست سے میرا تعلق! شاید تم مجھے نہیں پہچانتے۔ میں وہی ہوں جو ۲۱ اگست کو قوم سے رخصت ہوا اور تم؟ تم مضمون لکھتے اور پڑھتے رہے..." وہ کچھ اور بھی کہتے مگر میں "شاہ جیؒ"! کہہ کر اُن سے لپٹ گیا۔ میں نے کہا "شاہ جیؒ" آپ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ

از شاخِ جنوں فتادہ برگیم — مردیم در انتظار مرگیم
بایں ہمہ ضعف و ناتوانی ؟ — دانی ! کہ چہ کارہانہ کردیم
مامسلک روبہی نہ رفتیم — ماپیروی خراں نہ کردیم

برمسند فقر یگانہ فردیم

ترجمہ "ہم جنوں کی شاخ سے گرے ہوئے پتے ہیں۔ ہم موت کے انتظار میں ہیں حالانکہ ہم مر چکے ہیں۔ کیا جانتے ہو کہ ہم نے اس کمزوری اور ناتوانی کے باوجود کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔
ہم نے لومڑیوں (بزدلوں) کا مسلک اختیار نہیں کیا۔ اور ہم نے نہ ہی گدھوں (احمقوں) کی پیروی کی ہے۔ ہم فقر کے بوریا نشین اپنی مثال آپ ہیں۔"

میری بات کو شاہ جی نے بغور سنا اور پھر جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا شاہ جی کوئی نصیحت ؟ تو فرمایا "بیٹا ! محرومیوں کے باوجود اپنی ذات پر اعتماد قائم رکھنا قوموں کی زندگی ایک تسلسل کا نام ہے اس تسلسل کو قائم رکھنا" اس کے ساتھ ہی ایک جھماکہ ہوا اور میرے ساتھ محوِ گفتگو ہستی ایک نورانی سے ہیولے کی صورت میں اوپر کو اُٹھ گئی گویا کوئی ستارہ میرے قریب سے ہو گزرا تھا۔ کہ اتنے میں مؤذن کی صدا نے مجھے بیدار کر دیا۔ اللہ اکبر اللہ اکبر ! اور میں یہ پڑھتا ہوا اُٹھ بیٹھا کہ

؎ کمان شب سے سحر کار تیر چھوڑ گیا
ستارہ ٹوٹ کے روشن لکیر چھوڑ گیا

سیدنا حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ :

حکومتِ الٰہیہ

جب تک کہ غیرِ حق کی یونہی بندگی ہے دوست
یہ زندگی بھی میری کوئی زندگی ہے دوست ؟

ذرّوں سے تا بہ مہر ستاروں سے تا چمن
عکسِ جمالِ یار کی تابندگی ہے دوست

مرزائیوں کے گورو گھنٹال مرزا طاہر کے نام

ملّت ہے خبردار

کذّاب زمانہ کی رسالت کے طرفدار — الدّجّل کی مکار صحافت کے طرفدار
ابلیس کی مردود، قیادت کے طرفدار — دجّال کی اس تازہ خباثت کے طرفدار
ہر مکر و ریا سے تیری احرار ہیں ہشیار
ملّت ہے خبردار

آقا تیرا انگریز کی چوکھٹ کا گداگر — کاسہ گدائی لئے پھرتا رہا دردر
لعنت کی ملی بھیک جسے ملک میں گھر گھر — ذلّت کی مراموت زمانے میں وہ آخر
کہتا ہے زمانہ جسے مردود و گناہ گار
ملّت ہے خبردار

احرار نے مرزا کی نبوّت کو پکارا — احرار ہے ایمان کا بہتا ہوا دھارا
احرار ہے طوفانِ حوادث میں کنارا — احرار ہے "ملّت کے مقدر کا ستارا"
احرار ہے صدیقؓ کے ایمان کی للکار
ہر جھوٹے نبی کے لئے تلوار کی جھنکار
ملّت ہے خبردار

احرار کے دامن میں ہیں انوارِ الٰہی — احرار کا لشکر ہے محمدؐ کا سپاہی
احرار نے پھر جان کی بازی ہے لگائی — احرار کی دم ساز ہے اب ساری خدائی
ہیں تاجِ نبوّت کے نگہدار فدا کار
احرار ہیں بیدار
ملّت ہے خبردار

۱؎ مرزائیت کا ترجمان اخبار الفضل ۲؎ مرزا طاہر

اس ملک میں، کذّاب نبوت نہ چلے گی شیطان کی حفاظت میں امامت نہ چلے گی
اِس مُلک میں فرسودہ قیادت نہ چلے گی ہشیار! کہ مکار سیاست نہ چلے گی!

احرار ہیں بازارِ شہادت کے خریدار
ہیں تاجِ نبوت کے نگہدار، فداکار
ملت ہے خبردار

اِس معرکۂ کفر میں احرار ہیں تیار اور عشقِ محمد میں ہیں آ پہنچے سردار
دجالِ زمانہ کو، کوئی کردے خبردار بوبکرؓ و عمرؓ ساتھ ہیں اور حیدرِ کرارؓ

یہ آخری پیغام ہے اے اِدین کے غدّار
احرار ہیں تیار!
ملت ہے خبردار

اِک شیر تھا جو گونج رہا تھا کچھار میں

شاہ صاحب مرحوم کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ لکھتا لیکن اپنی محرومیٔ قسمت کو کیا کروں جس نے مجھے اُن کی خدمتِ بابرکت میں کبھی حاضر ہونے کا موقع نہ دیا۔ ایک بار البتہ اُن کی بے مثال خطابت سے مستفید ہونے کی سعادت ضرور نصیب ہوئی۔ دہلی دروازے کے باہر ایک بہت بڑا جلسہ تھا اور شاہ صاحب ہی صدر اور وہی اس کے واحد مقرر تھے۔ دس بجے شب کے بعد تشریف لائے اور بیٹھ کر تقریر شروع کی کہ آغاز میں ایک جوئے نرم رو کی سی کیفیت رکھتی تھی لیکن جوں جوں رات بھیگتی گئی آواز میں بلندی، کلام میں گرمی اور تخاطب میں روانی برابر بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ رات کے پچھلے پہر زمین و آسمان میں سناٹا تھا اور ع — اِک شیر تھا جو گونج رہا تھا کچھار میں
میں نے مولانا محمد علی جوہر کو بھی سُنا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت سے بھی فیضیاب ہوا ہوں مولانا ظفر علی خان کے سحرِ گفتار میں آج بھی اسیر ہوں لیکن سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے زورِ بیان اور نیرنگیٔ گفتار کا ایک اپنا مقام بلند تھا کہ آج تک جس کی مثال نایاب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی تربت کو عنبریں فرمائے اور اپنے دامانِ رحمت میں جگہ دے۔

(مولانا صلاح الدین احمد، آغا شورش کے نام خط، جنوری ۱۹۶۲ء)

روایت : ظفر اقبال سلیم
تحریر : سید ضمیر جعفری
مرسلہ : عبدالرحمٰن حامی نقشبندی

امیرِ شریعتؒ کا ایک خط

بعض لوگوں کی گفتگو اتنی رس بھری ہوتی ہے کہ اگر وہ عین مین اپنا کہا ہوا لکھ دیں تو ایک دلچسپ مطالعہ مرتب ہو جائے ہمارے دوست ظفر اقبال سلیم کو قدرت نے یہ جوہر بڑی فیاضی سے عطا کیا ہے ایک مرتبہ انہوں نے ہمیں امیرِ شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کے ایک سفارشی خط کی روداد سنائی جو تقریباً انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

میں ایم اے پاس کر کے اپنے آبائی شہر سانگلے چلا گیا کراچی سے ایک دوست نے جو میری طرح تازہ تازہ ایم اے پاس کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا خط لکھا کہ یہاں کراچی کے ایک کالج میں لیکچرار کی آسامی خالی ہے پرنسپل صاحب تقرر کے مجاز ہیں سنا ہے کہ پرنسپل صاحب سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے ارادت رکھتے ہیں تم یوں کرو کہ ان سے ایک سفارشی خط لیکر بھیج دو۔

میں شاہ صاحب کو ان کے قائدانہ مرتبے اور خطابت کی شہرت سے تو جانتا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ جیل کے اندر ہیں یا جیل کے باہر۔ حمید نظامی صاحب سے میرے مراسم تھے ان سے اتا پتا دریافت کیا معلوم ہوا شاہ صاحب ملتان میں قیام پذیر ہیں۔

سانگلے کی ریل گاڑی تڑکے ملتان پہنچتی تھی میں اس شہر سے قطعاً واقف نہ تھا۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی ایک صاحب سے، جنہوں نے جون کے مہینے میں بھی مغربی سوٹ بوٹ ڈانٹ رکھا تھا شاہ صاحب کے بارے میں پوچھا انہوں نے نہ صرف لاعلمی ظاہر کی بلکہ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اے نوجوان! ہم سرکاری ملازم ہیں ہم تو اُدھر سے گزرتے ہی نہیں جہاں سے شاہ صاحب کا گزر ہو" جیسے کہہ رہا ہو کہ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں اگلا دوسرے ہی آدمی نے جو عوام الناس کے مانند کٹا پھٹا تھا شاہ صاحب کے ٹھکانے کی نشاندہی کر دی اگرچہ موصوف صرف اتنا ہی بتا سکے کہ شاہ صاحب حسین آگاہی کی کسی مسجد میں درس دیتے ہیں۔

ملتان! خدا کے فضل سے مساجد کا شہر ٹھہرا، جبین آگاہی ہیں دو مسجدیں جھانکنے کے بعد تیسری ہیں جا کر امید بر آئی ۔ وہ بھی بقدر نصف۔ مسجد میں بچے قرآن پاک تو پڑھ رہے ہیں مگر شاہ صاحب کی بجائے کوئی اور مولوی صاحب درس دے رہے تھے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب گھر پر ہیں کیونکہ ان کی طبیعت چند روز سے ناساز ہے میں نے مولوی صاحب سے کہا "مولانا! میں بڑی دور سے آیا ہوں۔ حاضری ضروری ہے براہ کرم کوئی شاگرد رہنمائی کے لیے میرے ساتھ کر دیجیے ۔" مولوی صاحب قدرے ہچکچائے کچھ دیر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے رہے انکار کرنا چاہتے تھے مگر کر نہ سکے کہ ع

مروت حسن عالمگیر ہے مردان غازی کا

آخر ایک شاگرد میرے ساتھ کر دیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ دور سے آستانہ دکھا کر واپس آ جائیگا ۔

آستانہ مسجد سے خاصا دور تھا ہم وہاں تک تانگے پر گئے شاگرد نے استاد کے حکم کی حرف بحرف تعمیل کی دور سے شاہ صاحب کے آستانے کی نشاندہی کر کے لوٹ گیا ۔

دل [illegible] مکان دیکھ کر دنگ ہمارے ملک میں ایک بطل جلیل اور اتنے معمولی سے مکان میں رہائش پذیر، دروازے پر دستک دی تو ایک مولوی صاحب نکلے وہ مجھے اندر لے گئے شاہ صاحب پہلے ہی کمرے میں تشریف رکھتے تھے جو خاصا کشادہ تھا چٹائی بچھی تھی برصغیر پاک و ہند کا شعلہ نوا خطیب اور جنگ آزادی کا عظیم مجاہد ایک دیوار کے قریب ایک پرانے سے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا چند کاغذات سامنے بکھرے پڑے تھے ایک نیندہ تکیے کے نیچے دبا رکھا تھا میں نے سلام کیا آپ سلام کا جواب دیکر، جس میں تپاک کی گرمی تھی پھر اپنے کاغذات پر جھک گئے چند کاغذات تکیے سے نکالے چند تکیے میں رکھے، پھر خاکسار کو ایک نگاہ بندہ نواز سے نوازا اور گویا ہوئے "عزیزم! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کہو فقیر کے پاس کیسے آنا ہوا؟

اس سے پیشتر کہ میں کچھ عرض کرتا، فرمایا: "ماشاء اللہ! آپ ابھی نوجوان ہیں انگریزی آپ کے چہرے پر لکھی ہے ابھی عملی زندگی کی دہلیز پر کھڑے ہیں کیا آپ کو کسی نے فقیر کے ہاں آنے سے روکا نہیں ؟

میں بات نہ سمجھ سکا اور بولا "حضور! کوئی مجھے کیوں روکتا ۔

شاہ صاحب کا چہرہ مسکراہٹ سے کھل اٹھا، فرمایا: "ہمارے دروازے پر سی آئی ڈی کی نگرانی رہتی ہے کہیں آپ کا نام بھی گروہ وفا مستاں کی فہرست میں نہ لکھ لیا جائے لینے کے دینے نہ پڑ جائیں ۔"

میں دل میں قدرے ہراساں تو ہوا کہ دوست کو نوکری دلواتے دلواتے کہیں اپنی ملازمت ہی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں بہرحال، دل گردے پر ہاتھ رکھ کر ذرا کراری سی آواز میں اپنا مدعا بیان کیا اور حضرت کی خدمت میں باریابی کے متعلق اپنے اشتیاق اور جگرداری کا جذبہ حفیظ جالندھری کے ایک مصرع میں اس طرح ظاہر کیا کہ ع

دونوں جہان ہیں آج مرے اختیار میں

عرض مطلب سننے کے بعد شاہ صاحب کی پیشانی پر ایک لمحے کے لئے ایک متفکر سی شکن نمودار ہوئی جو دوسرے ہی لمحے ایک دل نواز تبسم میں ڈھل گئی۔

" صاحبزادے آپ نے جن پرنسپل صاحب کا نام لیا ہے میں تو ان سے واقف نہیں وہ شاید مجھے جانتے ہوں خیر!"

کمرے کے گوشے میں شاہ صاحب کی نشست کے نزدیک پانی کی ایک صراحی اور ٹین کا ایک ڈبہ رکھا تھا آپ نے صراحی سے پانی اور ڈبے سے کچھ دیسی شکر نکالی اور ایک کانسی کے کٹورے میں شربت گھولنے لگے باتیں بھی ہو رہی تھیں شربت بھی تیار ہو رہا تھا ادھر میرا دل ڈوبا جا رہا تھا کہیں یہ مشروب میری ہی تواضع کے لیئے تیار ہو رہا ہو میں نے دیسی شکر کا شربت کبھی پیا نہ تھا برف بھی نہ تھی؛ حالانکہ جون کا مہینہ تھا لیکن جب شاہ صاحب نے شربت میری طرف بڑھایا تو میں پورا کٹورا غٹاغٹ ایک سانس میں پی گیا شاہ صاحب غالباً میرے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ بھانپ گئے تھے فرمایا "فقیر کے ہاں تو یہی کچھ حاضر ہے؛"

وہ زبان سے کچھ بھی نہ کہتے تو میرے لیئے ان کی ایک نگاہ ہی کافی تھی میں سمجھتا ہوں کہ دیسی شکر کے اس ایک کٹورے نے زندگی سے میرے ربط کا زاویہ ہی بدل کر رکھ دیا۔

" میں ان صاحب کو جانتا تو نہیں"؛ شاہ صاحب کہہ رہے تھے "بہرحال، اگر میرے چند لفظوں سے کسی کا کام سنور جاتا ہے تو اس سے میرے دل کو بھی آسودگی ملے گی ہم کرسی پر تو نہیں؛ تاہم بعض لوگ ہماری بات سن بھی لیتے ہیں"؛ یہ کہہ کر آپ نے یہ مصرع پڑھا؛

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اب آپ نے تکیے کے نیچے سے کورا کاغذ نکالا اور رواں دواں چند سطور لکھ دیں زندگی میں اب تک ہم نے ہزاروں سفارشی خط دیکھے ہیں لیکن اتنی غیر سفارشی سفارش ہماری نظر سے نہیں گزری۔ لکھا تھا کہ ہر چند فقیر کو

آپ سے کوئی سابقہ نیاز تو حاصل نہیں لیکن ایک نوجوان کی ضرورت کے احساس سے یہ سطور لکھ رہا ہوں یہاں تک تو سفارشی ٹھیک چل رہی تھی لیکن آگے آپ نے صاف صاف یہ لکھ دیا کہ اگر یہ کام آپ کے ہاتھوں ہو گیا تو گویا یہ کام آپ نہیں کریں گے بلکہ خدا کرے گا اور اگر خدا کو منظور نہ ہوا تو ظاہر ہے یہ کام آپ نہیں کر سکتے

شاہ صاحب نے کچھ غلط بات نہیں لکھی تھی مگر آج کے زمانے میں اتنی درست بات کون سنتا ہے ؟

سفارش کی زبان پر خود ہمارے دل میں کھد بد ہو رہی تھی ہمارا کمزور ایمان ڈگمگا رہا تھا کہ ایسی سفارش پر جس میں آدمی کے پاس کوئی اختیار ہی نہ رہنے دیا گیا ہو بھلا کوئی آدمی کیوں دھیان دے گا مگر صاحب ! ہمارے دوست کو وہ اسامی مل گئی۔ سچ ہے کہ خدا اتنا ہی نہیں ہے جتنا آدمی کو نظر آتا ہے۔

میں سفارشی خط جیب میں رکھ کر الفاظ سپاس ہی سوچ رہا تھا کہ ناگاہ حضرت نے ایک سوال پوچھ لیا :

" ہم نے ایک خبر پڑھی ہے کہ انٹرنس کے امتحان میں موسیقی، نصاب میں ایک مضمون کی حیثیت سے شامل کی جا رہی ہے لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ ! یہ کیا فتنہ کلاہ برپا ہو رہا ہے ؟ آپ کو تو کچھ خبر ہو گی کہ آپ تازہ وارد ان بساط نو میں سے ہیں کچھ اس نئے فتنا رگیسو وچاک قبا کا حال تو بتائیں "

واقعہ یہ تھا کہ مجھے نصاب تعلیم میں اس تبدیلی کی قطعاً کوئی خبر نہ تھی ہم اپنی تعلیم ختم کر چکے تھے اس کے بعد درس اور مدارس میں بقول

اپنی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے

مجھے چاہیئے تھا کہ میں سیدھے سیدھے دو چار لفظوں میں اپنی پوزیشن واضح کر دیتا کہ حضور میں اس خبر کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر شاید شاہ صاحب کی نغز گفتاری نے میرے اندر چھپا ہوا کالج یونین کا سابق جنرل سیکرٹری بیدار کر دیا میرے منہ سے نکل گیا :

" حضرت ! یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ موسیقی انٹرنس کے نصاب میں شامل کی جا رہی ہے یا نہیں مگر حضور کسی انگریز مفکر کا قول ہے کہ موسیقی روح کی گرد کو دھو ڈالتی ہے "

شاہ صاحب نے اس پر ایک زبردست قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا " مجھے ڈر ہے موسیقی گرد کے علاوہ کہیں پوری روح ہی کو نہ دھو ڈالے "

دو ایک جملے تو انہوں نے شگفتہ شگفتہ طنز میں ادا فرمائے جن میں مجھے مخاطب کر کے اقبال کا یہ مصرع بھی سنایا کہ

ع ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

لیکن دو چار جملوں کے بعد وہ جلال میں آ گئے۔ خطابت کا دریا چڑھاؤ پر آگیا وہ باقاعدہ تقریر کرنے لگے جیسے ان کے سامنے میں اکیلا نہ بیٹھا تھا بلکہ حاضرین کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

کیا نظامِ تعلیم پر تیر برس رہے تھے: "یہ کیا نظامِ تعلیم ہے جو بے حیثی کے سوا کچھ نہیں دے سکتا؟ — جو دخترانِ ملت کو نچوانے پر تلا ہوا ہے"

حکومت کے پرزے اڑ رہے تھے: "تعلیم کم ہے تخلیص زیادہ ہے پبلسٹی پر زور ہے قلندری نے خواجگی کی قبا اوڑھ لی ہے"

کچھ مخلوط اقوال تھے مثلاً: "شہزادے تب بگڑتے ہیں جب وہ علماء سے منہ موڑ لیتے ہیں"

تعلیم کی غایت کو اسلام کے نظامِ عدل و معاش سے مربوط کرتے ہوئے فرمایا: "اسلام اپنی ایک نئی دنیا پیدا کرتا ہے اسلام اپنی علیحدہ پہچان رکھتا ہے اسلامی معاشرے میں آدمی کا سماجی مرتبہ رنگ، نسل، دولت وغیرہ سے متعین نہیں ہوتا اعمال سے متعین ہوتا ہے"

ایک ذاتی سی فہمائش جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گی یہ فرمائی: "بیٹا! محرومیوں کے باوجود اپنی ذات پر اعتماد قائم رکھنا قوموں کی زندگی ایک تسلسل کا نام ہے اس تسلسل کو زندہ رکھنا"

شاہ صاحب کے ایک ایک لفظ سے اضطراب و جلال کا دریا چھلک رہا تھا ان کی آواز دور دور تک جا رہی تھی لگتا تھا جیسے کوئی زخمی شیر دہاڑ رہا ہو۔

میں، بلکہ سارا ماحول، اس وقت شاہ صاحب کے سحرِ خطابت میں جھوم رہا تھا حقائق دل میں ترازو ہو رہے تھے ادب کا چشمہ ابل رہا تھا وہاں سے اٹھنے کو جی تو کیا چاہتا مگر ساتھ ہی ڈر لگ رہا تھا کہ اگر "سی آئی ڈی" نے پہلے چشم پوشی سے کام لیا بھی تھا تو اب ضرور دھر لے گی چنانچہ ایک مقام پر جیسے ہی ان کا آشوبِ دل ذرا دھیما ہوا ہم اجازت لے کر آستانے سے باہر نکل آئے مگر بہت دور تک قدم اور دل بوجھل بوجھل رہے یہ ملال کا بوجھ تھا کہ دیکھو جو شخص اس ملک کی آزادی کے لئے اپنے خونِ جگر سے چراغ روشن کرتا رہا اس کے حجرے میں بتی نہ دیا ہے!

(بشکریہ اردو ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۸۳ء)

مولانا عبدالحق چوہان

حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ تعالیٰ کی ایک اہم ملاقات کے اثرات

۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ بستی مولویاں ضلع رحیم یار خاں میں مدرسہ شمس العلوم کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا جس میں حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر تھی۔ حسنِ اتفاق کہ انہی ایام میں حضرت خواجہ میاں عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین درگاہ عالیہ بھرچونڈی شریف ضلع سکھر بھی بستی میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی جس وقت تقریر شروع ہوئی تو حضرت صاحب بھی دورانِ تقریر جلسہ گاہ میں تشریف لائے اور جلسہ گاہ کی آخری صف میں آکر بیٹھ گئے۔ حضرت امیرِ شریعت کے شدید اصرار پر آپ سٹیج پر تشریف لائے۔ پوری تقریر میں ان کی آنکھیں اشک بار رہیں۔ اختتامِ جلسہ پر حضرت صاحب اپنی اقامت گاہ پر تشریف لے گئے اور حضرت امیرِ شریعت اپنی جگہ پر۔ عشاء کے وقت حضرت صاحب نے مولانا صالح محمد صاحب مرحوم کے توسط سے حضرت شاہ صاحب سے ملاقات کے اشتیاق کا اظہار کیا اور حضرت شاہ صاحب نے بصد مسرت ملاقات پر آمادگی ظاہر فرمائی اور حضرت صاحب شاہ صاحب کی اقامت گاہ پر تشریف لے گئے اور رات کا اکثر حصہ آپ نے حضرت شاہ صاحب کی معیت میں گزارا۔ اس ملاقات میں کیا گفتگو ہوئی اور کیا مسائل زیرِ بحث آئے؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں کیونکہ تیسرا کوئی شخص بھی شریکِ مجلس نہیں تھا۔ اور نہ ہی کسی کو شرکت کی اجازت تھی۔ اس ملاقات کے بعد دیکھا گیا کہ حضرت صاحب حضر و سفر میں ایک صندوقچہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ احقر بھرچونڈی شریف میں مقیم تھا اور حضرت صاحب کہیں سفر پر جا رہے تھے۔ حسبِ معمول وہی صندوقچہ آپ کے ساتھ تھا۔ سفری سامان کے باعث یا کسی اور سبب سے حضرت صاحب نے وہ صندوقچہ مجھے دیا کہ فی الحال اس کو کہیں رکھ دو۔ واپسی پر مجھے دے دینا۔ میں اپنی اقامت گاہ پر وہ صندوقچہ لے گیا اور وہاں جا کر اس کو کھولا وہ صندوقچہ تمام کا تمام مرزائیت کی تردید کے لٹریچر سے بھرا ہوا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرزائیت کے متعلق حضرت صاحب کا یہ مطالعہ حضرت امیرِ شریعت کی اس ملاقات کا نتیجہ تھا جو کہ بستی مولویاں میں ہوئی تھی۔ معلوم نہیں کہ حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی اس طرح تبلیغی محافل کے متاثرین کی کیا تعداد ہوگی؟

اختر جنجوعہ

شاہ جی کا قافلۂ احرار

آج جب کہ کاروانِ ملت رواں صدی کے آٹھ مراحل طے کر آیا ہے تو اگر پلٹ کر قطع کردہ راہوں کو دیکھا جائے تو ان گنت شہ نشان ہیں جو روشن تاروں کی طرح دمک رہے ہیں۔

یہ سب روشن منطقے، ایثار، قربانی، مروت اور بے لوث جذبوں کی علامات ہیں۔ یہ تختہ دار پر اذانیں دینے؛ جیلوں میں مشقتیں کرنے اور چکیاں پیسنے والے ایثار پیشہ کارکنوں کے لہو اور پسینے سے روشن چراغ ہیں جو ظلمتوں میں ہمیشہ نور بکھیرتے رہیں گے۔

ہمارے دورِ غلامی کی تاریخ شرمساری سے عبارت، پشیمانی پر ندامت کے آنسوؤں کی تاریخ نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہماری قومی زندگی کا ایک ولولہ انگیز باب ہے۔ اس باب کو رقم کرنے کے لئے تہی دست قوم نے کیا کچھ دیا اور پھر بے بس کے کانپتے ہاتھوں کیا کچھ حاصل کیا۔ یہ آگہی اور عبرت کا موضوع ہے جو مستقبل کے طالب علم کے فکر و شعور کو نئی جلا بخشے گا۔

بطلِ حریت، امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ایمان افروز اور حیات آفریں قیادت میں مجلسِ احرار اسلام قومی زندگی کو ایک نئی ڈگر پر چلانے کا ولولہ لئے ۱۹۲۹ء میں میدانِ عمل میں اُتری۔ مجلسِ احرار سادہ دل، مخلص، کم مایہ مگر پُرعزم افراد کی ایک جماعت تھی۔ حریتِ فکر اور جرأتِ اظہار کی دولت عام کرنا اس کا شیوہ عمل اور سولے کو شہباز سے لڑا دینے کی جرأت عطا کرنا اس کا مطمعِ نظر تھا۔

مجلسِ احرارِ اسلام کے حصہ میں اتنے بلند پایہ خطیب آئے کہ ہندوستان کی دوسری جماعتوں کے حصہ میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ آیا تھا۔ ارضِ ہمالہ کے رہنے والوں نے جب ان آتش نفس مغنیوں سے آزادیٔ وطن کے گیت سُنے تو ایک اضطراب ان کی روح کی گہرائیوں سے اُبھرا۔ قوم کے راہبر ابھی سوچ میں تھے کہ یہ فرزانے میدانِ عمل میں کود پڑے پھر فکر و عمل کے

اِس سیلاب کی منہ زور موجیں کبھی کشمیر کی گلپوش مگر سنگلاخ وادیوں، کبھی لکھنؤ میں باہمی نفرت کے بلند حصاروں اور کبھی شہید گنج لاہور کے گنبد و مینار سے ٹکرائیں تو ہر مرتبہ ایک تزلزل بپا ہوگیا۔ گو دنیاوی مال وجاہ سے اس کے رہنماؤں کے دامن خالی ہے مگر ان کی ندرتِ عمل ذوقِ انقلاب کو تابندگی بخشتی رہی۔ برصغیر کی قومی زندگی کے انتہائی اہم ماہ وسال کا تذکرہ ان عالی حوصلہ انسانوں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔

ان میں سیدالاحرار امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے علاوہ چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر، شیخ حسام الدین، مولانا گل شیر شہید، احسن عثمانی، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، ماسٹر تاج الدین انصاری، آغا شورش کاشمیری جیسے قائدین کے علاوہ لاکھوں ایسے کارکن بھی تھے جو آزادی یا موت کا نعرہ لگا کر جان کی بازی لگایا کرتے تھے۔ ان کارکنوں میں عبدالکریم مباہلہ (قادیان) سے لے کر ——— نورخان کوہاٹی تک کئی ایسے متوالوں کے نام آئیں گے۔ جو وفا آشنا تھے۔ سخت کوش اور متوکل تھے۔ شجاعت وتہوّر کی انوکھی روایات کے بانی تھے اور ایسے بھی تھے جن کا نام تاریخ کے صفحات پر نہ آسکا۔ مگر ابدی سچائیوں کا نور لے کر یہ سب لوگ کل مالکِ جزا و سزا کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔

امیرِ شریعت کی ولولہ انگیز قیادت میں کاروانِ احرار نے شاہراہِ حیات پر ایسے نقوشِ قدم چھوڑے ہیں جنہیں وقت کی تند و تیز آندھیاں کبھی نہ مٹا سکیں گی۔

قیامِ پاکستان کے وقت جو مجلسِ احرار کی حیاتِ اُولیٰ کا دور تمام ہوا تو احرار کے دامن میں العربی کی پاکیزہ روایات کے علاوہ اپنوں کی جانب سے پھینکے گئے چند پتھر بھی تھے۔ ظاہر ہے سامراج دشمنی کا صلہ اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا جا سکتا تھا۔

پھر حیاتِ ثانی کے آغاز ہی میں جوشِ احرار اپنے بوڑھے مگر بلند حوصلہ جرنیل کی رہنمائی میں ختمِ نبوت کے تحفظ کیلئے کفن بردوش میدانِ وفا میں اترے۔

سبائیت کے پھیلتے ہوئے خطرات کا سامنا کرنے کے لئے بھی ناموسِ اصحابِ رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پاسبانی ان کا فریضہ قرار پائی اور آج بھی یہ کارواں مقاصد کی بلندی اور ذوقِ عمل کی حقانیت پر یقین کے ساتھ زندگی کی منازل طے کر رہا ہے۔

عظمت کے نقوش

سیّد محمد یونس بخاری

بطلِ حریت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ کی یاد میں

تو کہ اقلیم خطابت کا شہنشاہ بھی تھا
اک قلندر کی طرح مردِ خود آگاہ بھی تھا
ایک درویش خدا مست و بہی خواہ بھی تھا
ھمرہِ تیغ زباں سیّدِ جنگاہ بھی تھا

تو نے مجبور زبانوں کو نوا دی جس دم
انقلابات کے تذکار تھے گردن زدنی
جس نے آزاد فضاؤں کا کبھی نام لیا
اس پہ تیار تھی ہر وقت ہی نیزے کی انی

لوحِ تاریخ پہ کندہ تیری عظمت کے نقوش
تو نے یخ بستہ عزائم کو حرارت بخشی
خال و خد ملّت ترساں کے سنوارے تو نے
حریت کیش رفیقوں کو جسارت بخشی

عرصۂ جہد کو پُر کیف کیا تھا تو نے
چشمۂ علم کو عرفان دیا تھا تو نے
تخت افرنگ کی زنجیر غلامی کاٹی
ملّت پاک کا ہر چاک سیا تھا تو نے

ماہر القادری

تحریکِ آزادی کا مقدمۃ الجیش

میری جوانی کا زیادہ تر حصہ حیدر آباد دکن میں گذرا ہے، یو۔ پی، پنجاب، بہار اور دوسرے صوبوں کے مشاہیر کے حالات اور خبریں، دکن ہی میں دوسروں کی زبانی سُنا کرتا تھا: مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی تقریر و خطابت کی شہرت میں نے وہیں سُنی اور تواتر کے ساتھ اہلِ علم کی زبانی سنی، اخبارات میں بھی ان کا ذکر آتا تھا دل چاہتا تھا کہ شاہ صاحب (مرحوم) سے ملوں، بات چیت کروں اور ان کی تقریر سنوں! مگر شاید میری یہ تمنا خام تھی۔ اس لئے مشیت کا ایما رہا تھا۔

اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

میں حیدر آباد دکن سے اپنے وطن سال کے سال آیا کرتا تھا ایک بار اپنے ایک عزیز کے یہاں علی گڑھ میں آکر ٹھہرا تو ایک صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ پرسوں مسلم یونیورسٹی میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی تقریر تھی۔ یہ خبر سن کر اپنی محرومی پر افسوس ہوا کہ میں آج کی بجائے، دو دن پہلے آجاتا، تو شاہ صاحب کی تقریر سننے کا ارمان پورا ہو جاتا۔ یہ میں بائیس برس پہلے کی بات بیان کر رہا ہوں۔

اُن صاحب نے بتایا کہ شاہ صاحب کی خطابت نے سننے والوں پر جادو سا کر دیا خاصی طویل تقریر فرمائی، مگر سامعین نے ذرا سی بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کی، شاہ صاحب نے فرمایا!

"سکیفٹی ریزر سے گالوں کو کھرچنے سے جوانی ظاہر نہیں ہوتی، جوانی تو وہ ہے جو رخساروں کے بال بال سے پھوٹ نکلے ....."

طلبا اور پروفیسروں کی غالب اکثریت "ڈاڑھی منڈوں" کی تھی، شاہ صاحب کے یہ جملے سن کر وہ نادم سے ہو گئے اور کسی کے تو سناٹے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم، جو خطابت میں اپنی نظیر آپ تھے، مولانا ابوالکلام

آزاد اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی تقریر سننے کا اشتیاق رکھتے تھے، ایک بار انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ مولانا آزاد سے ٹرین میں ملاقات ہوگئی، کئی گھنٹے اُن کا ساتھ رہا، میں نے ان سے "اجتہاد" کے بارے میں دریافت کیا، بولے:۔ "نواب صاحب!

اگر دین میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا، تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ "سعادت و فلاح" کی راہ میں دیواریں کھڑی کر دی گئیں ......"

نواب صاحب مرحوم نے فرمایا کہ مولانا آزاد کی بات چیت ہی میں "تقریر و خطابت" کا لطف آگیا مگر نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی شاہ صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ خود شاہ صاحب بھی نواب صاحب سے ملنے کی تمنّا رکھتے تھے۔

بعض اربابِ ذوق شاہ صاحب مرحوم کے جملوں کی نقل انہی کے لہجہ میں کرتے، ایسی باتوں نے میری آتشِ شوق کو اور تیز کر دیا ایک صاحب نے بیان کیا کہ گونڈے میں شاہ صاحب نے عشاء کے بعد تقریر شروع کی ہے۔ تو فجر کے وقت یہ شعر ؎

محفل خموش، صبح کے آثار جلوہ گر
اب حکم ہو تو ختم کروں داستاں کو میں

اپنے مخصوص دل کش ترنم میں پڑھا اور تقریر جب ختم کی ہے تو سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ اور لوگ محسوس کر رہے تھے کہ ان کا سامعہ سچ مچ رات بھر "کوثر و تسنیم" میں ہلکورے لیتا رہا ہے ـــ" خطابت شاہ صاحب کی کرامت تھی۔"

(غالباً) ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے کہ لائل پور کاٹن ملز کے مشاعرے میں میرا لائل پور جانا ہوا۔ اور وہاں جا کر یہ مژدہ ملا کہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ان دنوں یہاں آئے ہوئے ہیں! جناب انور صابری پہلے سے لائل پور میں براجمان تھے۔ وہ شاہ صاحب سے مل بھی چکے تھے۔ میں نے شاہ صاحب کا ذکر چھیڑا تو بولے، میں تمہیں لے کر ابھی ابھی شاہ صاحب کی قیام گاہ پر چلوں گا۔ وہ بھی تم سے ملنے کا اشتیاق رکھتے ہیں!

شاہ صاحب مرحوم کے یہاں جو پہنچنا ہوا تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور خوب بھینچ بھینچ کر بغل گیر ہوئے ان کی اس پذیرائی، غیر معمولی شفقت اور خورد نوازی کو دیکھ کر میں "فرشِ پا انداز" ہوا جاتا تھا۔ بیٹھتے ہی بولے۔

"تمہارے شعروں سے میں کیا کام لیتا ہوں ... یہ میری تقریروں سے معلوم ہوگا۔"

پھر ان کے ایما پر شعر خوانی ہوئی ایک غزل سنا چکا تو دوسری کے لئے فرمائش کرتے، داد دینے کا انداز والہانہ تھا، میں نے زندگی میں بہت ہی کم لوگوں کو اتنی صحیح اور معقول داد دیتے ہوئے دیکھا ہے۔

دوسرے دن شام کو شاہ صاحب کی تقریر تھی، ان کی تقریر سننے کا اشتیاق کشاں کشاں مجھے جلسہ گاہ میں لے گیا، شاہ صاحب نے تقریر کے آغاز ہی میں فرمایا۔

"دو آدمیوں کی دو تمنائیں تھیں ایک کی تمنا پوری ہوگئی یعنی میں نے ماہر القادری کا کلام ان کی زبان سے سن لیا، ماہر القادری میری تقریر سننے کی تمنا رکھتے ہیں، مگر میں اتنے بہت سے پنجابی بولنے والوں کی نظر انداز کر کے صرف ان کے لئے "اردو" میں تقریر کیسے کروں؟! مگر پھر بھی میں اپنی تقریر میں ماہر القادری کے ذوق و تمنا کی رعایت ملحوظ رکھوں گا۔"

حضرت شاہ صاحب نے ملی جلی اردو اور پنجابی میں تقریر کی یہ غالباً ان کا پہلا تجربہ تھا زبان کی اس دورنگی اور دوعملی نے تقریر میں خاصہ تکلف پیدا کر دیا اتنے میں ایک صاحب کار لے کر مجھے لینے آ گئے۔ ڈیپٹی کمشنر کے یہاں شاعروں کا ایٹ ہوم تھا۔

اس واقعہ کے دو ڈھائی سال بعد، دلی میں شاہ صاحب کی تقریر کا اعلان ایک پوسٹر میں نظر سے گذرا، میں رات کو ٹھیک وقت پر جلسہ گاہ میں پہنچا، ہزاروں کا مجمع پہلے سے موجود تھا اور لوگ آئے چلے جا رہے تھے، شاہ صاحب نے کلام پاک کی تلاوت کے بعد میر کے اس شعر سے اپنی تقریر کا آغاز کیا ؎

اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی، زنجیر نظر آئی

یہ وہ زمانہ تھا جب وہ مسلم لیگ کے شدید مخالف تھے اور سیاست میں مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے مسلک کے پورے پورے متبع اور مقلد تھے شاہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

"اتنا بڑا مجمع کہ یہاں سے تالی اچھال دوں تو شاید ایک فرلانگ تک وہ تالی سروں ہی پر اچھلتی اور تیرتی رہے مگر میں سننے والوں کی اس بھیڑ سے کچھ خوش نہیں ہوں تم لوگ کانوں کے عیاش ہو تم تقریر کے چٹخاروں کی طرح یہاں آئے ہو دوسرے کمیپ والوں کا جلسہ ہوتا ہے تو وہاں بھی تم اسی ذوق

وشوق کے ساتھ جاتے ہو"

شاہ صاحب نے جب تقریر ختم کی ہے، تو تین گھنٹے ہو چکے تھے، مگر محسوس یہ ہو رہا تھا کہ تقریر شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی شاہ صاحب کی شگفتہ بیانی نے وقت کی طوالت کا احساس ہی نہیں ہونے دیا ورنہ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد بڑے سے بڑے خطیب اور مقرر کی تقریر کھلنے لگتی ہے۔

اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں انہیں ملتان میں بسوں کے اڈے پر اس حالت میں کھڑے دیکھا کہ ملگجے کپڑے پہنے تھے اور ہاتھ میں خاصا لمبا لٹھ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ میں قیام پذیر تھے اور مشہور یہ تھا کہ سیاست سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور خاموش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پھر شاہ صاحب نے ملتان کو اپنی اقامت گاہ بنا لیا۔ تبھی شیر خان کے ایک معمولی سے کچے مکان میں رہتے تھے۔ میں دو بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑے مزے کی چائے پلائی "چائے کے ساتھ کچھ لوازمات" بھی تھے اور ان سب سے بڑھ کر ان کے لطیفے اور چٹکلے (چائے کی پیالی میں ان کے تبسم کی شکر گھل جانے سے لطف دوبالا ہو گیا)۔ پہلی بار کی حاضری میں مجھ سے کہا اپنا "سلام" سناؤ، میں نے عرض کیا، آپ تو کئی بار سن چکے ہیں، فرمایا۔ "بھئی کچھ پردے میں رہنے والے بھی آپ کا "سلام" سننا چاہتے ہیں"۔

خاصی دیر تک شعر خوانی رہی، میرے اصرار پر اپنی فارسی نعتیہ غزلیں بھی سنائیں۔ شاہ صاحب کے بوریئے پر بیٹھ کر، شعر سننے اور سنانے کا جو لطف آیا، وہ لطف قیمتی صوفوں اور بیش قیمت قالینوں پر بھی میسر نہیں آیا، یہی وہ شانِ فقر ہے جس کے آگے سطوتِ شاہی دبتی اور مجرموں کی طرح شرماتی نظر آتی ہے۔

کراچی میں "تحفظِ ختم نبوت" کا دفتر میرے مکان سے قریب ہی تھا جب بھی شاہ صاحب کراچی تشریف لاتے ——— انکی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا ——— ایک بار ان کا ملتان سے آنا ہوا، مجھ سے پہلی ملاقات میں فرمایا:۔

"آپ کا لکھا ہوا افسانہ ابوذر (شاہ صاحب کے صاحبزادے) نے مجھے راستے میں سنایا تھا۔ افسانہ خوب تھا مگر افسانہ پھر افسانہ ہے اس میں جھوٹ ہی تو ہوتا ہے"۔

تقریباً ڈیڑھ سال ادھر کی بات ہے کہ میرا مظفر گڑھ کے مشاعرے میں جانا نکل آیا، وہاں آتے جاتے جناب صابر دہلوی کے یہاں ملتان ٹھہرنا ہوا۔ پتہ لگا کہ شاہ صاحب بیمار ہیں میں عاصی کرنالی صاحب

لوسا تھے کر ٹبی شہر خان پہنچا وہاں جا کر پتہ لگا کہ شاہ صاحب لاہور تشریف لے گئے ہیں! افسوس نہ ملنے کا اس وقت بھی افسوس رہا اور اب جب کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے یہ افسوس رنج و ملال میں بدل گیا میرا ہی شعر ہے۔

کیا کام اُسے معرکۂ تیغ و سناں سے
واعظ تو فقط زینت منبر کے لئے ہے

مگر شاہ صاحب ایسے واعظ تھے، جو منبر کی زینت بھی تھے، اور معرکۂ تیغ و سناں میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے، انگریز کے مستبد دَور میں حق گوئی کی بدولت جوانی کا آخری زمانہ اور اس کے بعد کے چند سال قید و بند کی مصیبت میں بسر کئے، چھوٹتے اور پھر گرفتار کر کے بند کر دئیے جاتے۔ یہ سلسلہ ایک دو نہیں اٹھارہ سال تک چلتا رہا۔ توپ، بندوق اور بم کے گولے تو گاندھی جی اور جواہر لعل نہرو نے بھی نہیں نہیں چھوڑے، انگریز کی مخالفت اور اس کی پاداش میں جیل خانہ تمام آزادی پسند لیڈروں کا یہی حال رہا ہے! عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم قربانی اور آزادی کی جدوجہد کی منزل میں "مقدمۃ الجیش" سے بھی آگے نظر آتے ہیں۔

عشق رسول انکی سیرت و کردار کا سب سے بڑا نمایاں وصف ہے، حضور خاتم النبیین کی محبت ان کے مزاج و طبیعت میں رچی ہوئی تھی۔ قادیان کی جھوٹی نبوت کے خلاف انہوں نے "لسانی جہاد" کیا ہے بس یہی عمل خیر ان کی مغفرت کے لئے کافی ہے! (انشاء اللہ العزیز)

شاہ صاحب کو جو غیر معمولی شہرت ملی اور قبول عام حاصل ہوا اس کا سبب انکی خطابت تھی جس نے ان کی شخصیت کو ابھارا وہ بڑے حسین وجیہہ اور خوش شکل انسان تھے۔ سرخ سپید رنگ، خوب صورت ناک نقشہ، آواز میں درد اور لہجہ میں شیرینی، تقریر کرنے کے لئے اسٹیج پر آتے تو انکی صورت دیکھتے ہی لوگوں کے دل کھنچنے لگتے! سننے والوں کی دلچسپی کے لئے ہر چیز انکے پاس تھی شکل و صورت، آواز لہجہ، طرز ادا، شیرینی، نغمگی، طنز، لطیفے، چٹکلے کلام پاک کی تلاوت میں کس قیامت کا سوز اور درد تھا۔ ے

وہ پڑھیں اور سنا کرے کوئی۔

شعر پڑھنے کا انداز زیادہ دلنشین تھا۔ تقریر کرتے کرتے موضوع سے دور چلے جاتے تو ان کی خطابت کا زور اور بیان کی دل نشینی اس کا احساس بھی نہ ہونے دیتی۔ وہ اپنی ذات سے سچ مچ

انجمن واقع ہوتے تھے۔ ان کی زندگی جفاکشی اور مجاہدہ کی زندگی تھی۔

آدابِ شریعت کی وہ نگہداشت نہ کرتے تو اور کون کرتا وہ "امیر شریعت" تھے۔ حضرت شاہ صاحب اپنی ذات سے نیک اور خیر پسند تھے اللہ تعالیٰ شاہ صاحب اعلی اللہ مقامہ کی قبر کو خنک اور روشن رکھے۔ (برّد اللہ مضجعہ، نور اللہ مرقدہٗ) (ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۶۱ء)

نئی مطبوعات

مرزائیت کے قلعہ کو مسمار کرنے کیلئے عظیم ہتھیار

- عقیدۂ ختم نبوت علم و عقل کی روشنی میں
  مولانا محمد اسحٰق صدیقی
- اسلام اور مرزائیت — مولانا محمد عبد اللہ
- قادیانیوں کے دجل و فریب کے شکار مسلمانوں کو دعوتِ حق
  مولانا محمد عبد اللہ

ان کا مطالعہ تحریکِ ختمِ نبوت کے ہر کارکن کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

چلبلی یادیں

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ میں اندرون موچی دروازے کی طرف جا رہا تھا تو بیرون موچی دروازے نے قدم روک لئے باغ میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر ہو رہی تھی۔ اب آگے کون جانے بڑھاپے کے باعث گھن گرج قدرے دھیمی پڑ گئی ہے مگر خطابت کی لطافت کا جادو رہی تھا۔ ہم وہیں پا کر کھڑے ہو گئے دو گھنٹے انیس قدموں پر وہیں کھڑے رہے۔ جلسے میں بیس ہزار سے کم سامعین نہ تھے اور اتنے ہی لوگ گھروں کی منڈیروں سے بوڑھے شیر کی دھاڑیں سن رہے تھے۔ شاہ جی کی ساکھ کبھی ختم نہ ہوگی

(ضمیر جعفری کی ۱۹۴۹ء کی ذاتی ڈائری سے)

نصراللہ خان

وہ مرتے دم تک احرار میں شامل رہے

عالم باعمل، درویش خدامست، بے باک، نڈر، ادائیں قلندرانہ، جلال سکندرانہ بارعب چہرہ، رنگ سپید سُرخی مائل آنکھوں میں جلال، چہرے پہ جمال، لانبا قد، دہرا بدن، سر پر پٹے، گھنی داڑھی، بالوں پر مہندی لگاتے تھے۔ ان کی آواز میں بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج تھی۔ لمبا سیاہ کُرتا، پاؤں میں چپّل ——— یہ تھے سید عطاء اللہ شاہ بخاری، جن کے بارے میں مولانا ظفر علی خان نے یہ شعر کہا تھا:

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بُلبُل چہک رہا ہے ریاضِ رسُولؐ میں

آدھی عمر جیل میں گزار دی۔ فرنگی حکومت ان کے نام سے کانپ جاتی۔ جس شہر میں جلسے نوبت پہ چوٹ پڑتی۔ اور نقارچی یہ اعلان کرتا کہ آج فلاں مسجد یا فلاں باغ میں امیرِ شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کریں گے تو لوگ جوق در جوق جلسہ گاہ میں اس طرح پہنچتے، جیسے عید کی نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ کیا بچے، کیا جوان، کیا بوڑھے اور کیا عورتیں حدِّ نظر مخلوقِ خدا نظر آتی۔ شاہ جی نمازِ عشاء کے بعد اپنی تقریر شروع کرتے۔ لاؤڈ سپیکر اور مائکروفون کا رواج نہیں تھا۔ اس زمانے میں مقرروں کے گلے میں لاؤڈ سپیکر ہوتا تھا۔ ان کی آواز ایک محلّے سے دوسرے محلّے میں پہنچتی تھی اور شاہ جی کی آواز تو میلوں پہنچتی۔ شاہ جی نجانے کیا سحر کرتے کہ جب وہ بولتے تو لوگوں کو سانپ سونگھ جاتا۔ کسی کو پہلو بدلنے کا موقع نہ ملتا۔ لب بند ہو جاتے۔ ہنسانے پہ آتے تو مجمع کشتِ زعفران بن جاتا اور رُلانے پہ آتے تو خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رُلاتے۔ گریبان آنسوؤں سے بھیگ جاتے اور جب صبح کی اذان ہوتی تو لوگوں کو معلوم ہوتا کہ وقت کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

شاہ جی نے اگرچہ ساری زندگی پنجاب میں گذاری تھی۔ لیکن جب وہ تقریر کرتے تو ان کی زبان سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں کے ہیں۔ البتہ جب وہ تقریر کرتے کرتے وہ پنجابی بولنے لگتے تو یہ معلوم ہوتا کہ وہ پنجابی ہیں۔ تلاوت

اس طرح کرتے کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے یوں لگتا کہ جیسے خود قرآن بول رہا ہے۔ جب مثنوی مولوی ترنم سے پڑھتے تو لوگوں کو وجد آجاتا۔ بات یہ ہے کہ ان کی ہر بات ان کے دل کی گہرائی سے نکلتی تھی۔ تقریر کے دوران کبھی کبھی لطیفے بھی سناتے شاہ جی کا ہاتھ مجمع کی نبض پر رہتا۔ جب وہ یہ دیکھتے کہ بات ذرا لمبی ہو رہی ہے تو وہ ہنسانے لگتے اور پھر اپنی بات پہ آجاتے۔ فنِ خطابت تو شاہ جی پر ختم ہو گیا۔ ان کا حافظہ ایسا تھا کہ اردو، فارسی اور عربی کے ہزاروں اشعار انہیں یاد تھے وہ اپنی تقریروں میں سیاست کے ایسے نکتے اور ایسے پہلو نکالتے کہ لوگ حیران رہ جاتے۔

اس زمانہ میں بھی سیاست والوں نے بہت کھایا کمایا تھا۔ لیکن شاہ جی کی یہ حالت تھی کہ کپڑوں کا ایک جوڑا دھوتے تو دوسرا پہنتے، وہ اپنے سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ سردی کے موسم میں میں نے انہیں اپنی گدڑی سیتے دیکھا ہے وہ بڑے دیانت دار تھے وہ جو کہتے کر دکھاتے ان لوگوں کے پاس نہ پستول تھا اور نہ بندوق تھی ان کے ہتھیار ان کی سچائی تھی۔ ان کا کردار تھا اور ان کی پرتاثیر زبان تھی وہ اپنی تقریروں سے توپوں کے منہ کیل دیتے۔ ساری زندگی جیل میں کاٹی مسجد شہید گنج کے انہدام سے شاہ جی اور مولانا ظفر علی خان میں اَن بن ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر حملے کرتے لیکن ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے۔ شاہ جی کے بارے میں جہاں مولانا ظفر علی خان نے یہ کہا تھا کہ:

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے

بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں !

تو جب شہید گنج کا مسئلہ کھڑا ہوا اور مولانا احراریوں کے خلاف ہو گئے تو مولانا نے شاہ جی کے بارے میں یہ بھی فرمایا۔

اک طفل بری رو کی شریعت نگلی نے !

کل رات نکالا مرے تقویٰ کا دوالا

ایک مرتبہ میرے گھر کے سامنے شاہ جی تقریر کرنے کی غرض سے آتے۔ جلسے کے منتظمین نے مجھ سے کہا کہ شاہ جی تقریر کرنے سے پہلے تمہارے یہاں آکر بیٹھیں گے۔ میں نے کہا کہ شاید اس بات پر مولانا ظفر علی خان صاحب مجھ سے خفا ہو جائیں، لوگوں نے یہ بات شاہ جی کو بتائی تو وہ ہنس کر خاموش ہو گئے لیکن جب اس بات کا علم مولانا ظفر علی خان کو ہوا۔ تو وہ بہت خفا ہوئے اور کہا کہ شاہ جی تمہارے لیئے قابلِ احترام ہیں۔ ویسے میں بھی ان کا احترام کرتا ہوں۔ اب تم جاؤ اور شاہ جی سے معافی مانگو اور جب میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے معافی مانگنے لگا تو میری آنکھوں

سے آنسو جاری ہو گئے۔ شاہ جیؒ نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور میرے لئے دعا کی۔ اور فرمایا میں تم سے خفا نہیں ہوں ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔

شاہ جی کی من موہنی شخصیت جب بھی یاد آتی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ جوش صاحب کا یہ شعر بھی یاد آجاتا ہے

اُبھرے تو آندھی بپھرے تو طوفان
چٹکے تو غنچہ، لرزے تو شبنم

میں شاہ جی کا نیاز مند تھا۔ اکثر ان کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا ـــــــ اور ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی سے لطف اندوز ہوتا اور پھر جب کبھی ہمارے یہاں شب دیگ کا اہتمام ہوتا تو میں شاہ جی کو اپنے ساتھ لے آتا کبھی کبھی شاہ جی بھی ہمیں بلوا لیتے۔ شاہ جی بہت خوش خوراک تھے۔

شاہ جی کی آدھی سے زیادہ زندگی جیلوں میں کٹی۔ وہ جس تحریک میں شامل ہو جاتے تو بڑی دلجمعی سے اس کے لئے کام کرتے۔ وہ پارٹیاں نہیں بدلا کرتے تھے بلکہ اپنی پارٹی کو ڈھب پر لے آتے تھے۔ احراری ہونے کی وجہ سے ان کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن شاہ جی مرتے دم تک احرار میں شامل رہے شاہ جی میں استقلال بھی تھا اور استقامت بھی۔ وہ مصلحتوں کے آدمی نہیں تھے۔ وہ بڑے صاف سچے اور کھرے انسان تھے۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے دل کی دھڑکن بھی تھے اور آڑے وقت میں ان کا سب سے مضبوط اور قابل اعتماد سہارا بھی تھے وہ بھی تھے وہ خطیب تھے، ادیب نہیں تھے۔ لیکن جب وہ تقریر کرتے تو یوں لگتا کہ جیسے ادب اور شاعری انکی شخصیت اور خطابت میں گھل مل گئی ہے دم تقریر بڑے بڑے ادیب اور شاعر ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے۔

اللہ تعالیٰ شاہ جی کی روح پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے (آمین) ہم بھی کیسے بدنصیب اور احسان فراموش ہیں کہ اتنے بڑے جادو بیان اور سرفروش خطیب کو بھلا بیٹھے جس کی ساری زندگی قوم کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے میں کٹ گئی مولانا ظفر علی خان اور شاہ جی کا آخری زمانہ قابل عبرت۔ مولانا تو مفلوج ہو گئے تھے لیکن شاہ جی کو گرد و پیش کے حالات اور قوم کی بے حسی نے مفلوج کر دیا تھا

بُرائی بہر حال بُرائی ہے، جو انسان دوسرے کا بُرا چاہتا ہے وہ گویا اپنے یا اپنی اولاد کے لئے بدی کاشت کرتا ہے۔
امیر شریعتؒ

ابو مغیرہ عبدالرحیم نیاز چوہان

بیسویں صدی کا عظیم انسان

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ بیسویں صدی کا عظیم انسان جس کی خطابت مردہ دلوں کو زندگی کی توانائیاں بخش دیتی تھی وہ مرد درویش جس کی للکار سے تاجوروں کے تخت لرز اٹھتے تھے وہ جلال جلیل کہ جس کی مجاہدانہ ہیبت فرنگی استعمار کے پرشکوہ ایوانوں میں زلزلہ طاری کر دیتی تھی جس کی آواز نصف صدی تک برصغیر کی فضاؤں میں گونجتی رہی۔ اور اس آواز نے مایوس دلوں کی تاریکی میں امید کی روشنی پیدا کر کے انہیں جذبہ حریت سے سرشار کر دیا حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۱۰ھ - ۳ ستمبر ۱۸۹۱ء میں تجارت کے شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ دسمبر ۱۹۱۹ میں حضرت شاہ جیؒ نے جلیانوالہ باغ میں کانگرس اور مسلم لیگ کے مشترکہ اجلاس میں پہلی بار سیاسی تقریر کی اور یہاں سے ان کی سیاسی و اجتماعی زندگی کا سفر شروع ہوا۔ لاہور میں راجپال ہندو نے ایک کتاب شائع کی۔ جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کی گئی تھی۔ اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ مسلمانوں میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی۔ ہر طرف سے احتجاجی جلسے شروع ہونے لگے۔ راج پال کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی گئی مگر اسے عدالت نے بری کر دیا۔ ان دنوں لاہور میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی اس بنا پر نہ کوئی جلسہ ہو سکتا تھا نہ کوئی جلوس نکل سکتا تھا۔ انہیں دنوں حضرت شاہ جیؒ اور ان کے رفقاء منکر احرار چوہدری افضل حقؒ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ خواجہ عبدالرحمٰن غازیؒ۔ مولانا مفتی محمد کفایت اللہؒ اور مولانا احمد سعیدؒ دہلوی نے حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ ایک قانون بنایا جائے جس کے تحت کسی مذہب کے بزرگ کی توہین نہ کی جا سکے اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اسے سخت سزا دی جائے۔ اسی مطالبہ کے لئے احاطہ میاں عبدالرحیم بیرون دہلی دروازہ لاہور میں منکر احرار چوہدری افضل کی صدارت میں مجلس احرار کا عظیم جلسہ عام منعقد ہوا حضرت شاہ جیؒ نے اپنے سحر انگیز خطابتی انداز میں کہا مسلمانو! وہ دیکھو سامنے حضرت فاطمۃ الزہرہ تمہارے دروازے پر دستک دے رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں مسلمانو تم دیکھ رہے ہو کہ تمہارے سامنے میرے بابا کی توہین کی جا رہی ہے۔ اور تم چپ ہو۔ حضرت شاہ جیؒ کا یہ کہنا تھا کہ سارا

مجمع دھاڑیں مار مار کر رونے لگ پڑا اور پلٹ کر دیکھنے لگ گیا۔ جیسے واقعی حضرت فاطمۃ الزہرہؓ سامنے کھڑی ہیں حضرت شاہ جی نے یہ بھی کہا کہ مسلمانو یاد رکھو آج کے بعد یا کہنے والی زبان نہ ہے یا سننے والے کان نہ رہیں۔ غازی علم الدین شہید مجمع سے اٹھ کر گیا جس نے راجپال کو قتل کر دیا۔ حضرت شاہ جیؒ کو اس تقریر کے جرم میں ایک سال قید کی سزا ہوئی۔ شاہ جیؒ نے ۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی وطن میں حصہ لیا اس تحریک میں سول نافرمانی میں شاہ جیؒ نے انگریزوں کے خلاف سارے ہندوستان میں بغاوت کا علم بلند کیا اور سارے ہندوستان میں آپکی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے۔ مگر آپ دیناج پور سے گرفتار ہوتے اور چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ شاہ جیؒ فرماتے تھے کہ دیناج پور کی جیل بہت ہی سخت جیل مشہور تھی جب مجھے اس بدنام جیل میں قید کیا گیا تو ان دنوں میرے سر پر مراد آبادی ٹوپی تھی اس وقت جیل میں موجود علماء کرام اور دیگر لیڈروں نے میری دیکھا دیکھی ایسی ہی ٹوپیاں بنوائیں مگر جیل حکام کو ہماری یہ ٹوپیاں ناگوار گزریں۔ جب ہمیں اپنی سی آئی ڈی کے ذریعے یہ علم ہوا کہ ان ٹوپیوں سے صاحب بہادر چڑتے ہیں تو ہم سب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو جائے ہم ٹوپیاں ہرگز ہرگز نہیں اتاریں گے۔ چنانچہ ایک دن سپرنٹنڈنٹ جیل معائنہ کے لئے آئے اور آتے ہی ہم لوگوں کو کہا کہ یہ ٹوپیاں آپ اتار دیں۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا کہ یہ ٹوپیاں ہم ہرگز نہیں اتاریں گے یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے تم اس میں مداخلت نہیں کر سکتے۔ اس نے لاجواب ہو کر کہا یہ گاندھی کیپ ہے میں نے انکار کرتے ہوئے کہا نہیں یہ احمل کیپ ہے۔ اور اگر یہ گاندھی کیپ ہے تو یہ قمیض اور پاجامہ وغیرہ بھی گاندھی کا ہے میری ان کھری کھری باتوں پر انسپکٹر جیل تاؤ میں آ گیا اور اس نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو حکم دیا کہ ان لوگوں کی ٹوپیاں اتار لو میرے ساتھیوں نے جب انسپکٹر جیل کے غصہ کا پارا سرخ نشان سے آگے بڑھتا ہوا دیکھا تو خود بخود ٹوپیاں اتار دیں۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے میری طرف دیکھا اور حکم دیا کہ کہ بخاری ٹوپی اتار دو۔ میں نے گرجدار آواز میں جواب دیا ہرگز نہیں۔ تمہارا اترنے سے پہلے سر کی ٹوپی اتارنے والا بیٹا کسی ماں نے پیدا ہی نہیں کیا۔ حضرت بخاریؒ فرماتے تھے کہ ساری زندگی میں عدم تشدد کا پرچار کرتا رہا لیکن آج میں نے اپنے دل میں اٹل فیصلہ کر لیا تھا کہ حالات خواہ کچھ رخ بھی اختیار کر جائیں میں انشاءاللہ اپنی ٹوپی ہرگز نہیں اتارنے دوں گا۔ بلکہ اگر آج انگریز حاکم نے ہاتھ بڑھایا تو میں بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کا بدلہ آج ہی چکا دوں گا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے بڑھ کر میری ٹوپی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑا وہ اس وقت پسینہ سے شرابور ہو کر مشکل گرنے سے بچا۔ میں نے اس کی کلائی سے ہاتھ ڈھیلا کر دیا۔ پھر دونوں اعلیٰ افسر مجھ فقیر سے عملاً مار کھا کر

بڑبڑاتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئے

۱۹۲۹ء میں جب مجلس احرار اسلام کی تشکیل عمل آئی تو آپ اس کے پہلے صدر چنے گئے۔ حضرت شاہ جیؒ ۱۹۲۹ء سے لے کر آخر دم تک اپنی محبوب جماعت مجلس احرار اسلام سے وابستہ رہے آپ کو مجلس احرار اسلام سے کتنی لگن تھی اس کا اندازہ ان کے ارشاد سے ہوتا ہے کہ "خواہ ساری دنیا مجھے چھوڑ جائے مگر میں مجلس احرار اسلام کا علم بلند رکھوں گا حتیٰ کہ میں مر جاؤں تو میری قبر پر بھی اس کا سرخ پرچم لہراتا رہے گا۔"

۱۹۳۱ء میں مجلس احرار اسلام نے قادیان میں اپنا دفتر قائم کیا۔ اور شعبۂ تبلیغ تحریک تحفظ ختم نبوت کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۳۴ء میں قادیان میں ختم نبوۃ کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس میں حضرت شاہ جیؒ نے معرکتہ الآرا تقریر کی۔ آپ نے منکرین ختم نبوۃ کے حقیقی مقاصد بیان کئے۔ شاہ جی کو اس تقریر کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ شاہ جیؒ پر یہ مقدمہ گورداس پور کی عدالت میں زیر سماعت رہا۔ آخر شاہ جی کو اس مقدمہ میں چھ ماہ کی سزا سنا دی گئی۔ اس سزا کے خلاف سیشن کورٹ میں اپیل کی گئی۔ ان دنوں مسٹر جی ڈی کھوسلہ سیشن جج تھے۔ اس نے حضرت کی اپیل کا فیصلہ سناتے ہوئے تا برخاست عدالت کی سزا دی۔ حضرت شاہ جیؒ مقدمہ سے فارغ ہوئے تو مجلس احرار اسلام کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ حضرتؒ پہلا جمعہ قادیان میں پڑھائیں گے۔ قادیان میں حکومت نے نماز جمعہ پر پابندی عائد کر دی تھی۔ تاہم اس پابندی کو توڑنے کے لئے حضرت مقررہ وقت پر امرتسر سے قادیان کے لئے روانہ ہوئے۔ بٹالہ اسٹیشن پر عوام نے حضرتؒ کا والہانہ استقبال کیا مگر پولیس نے بٹالہ ہی پر حضرت شاہ جیؒ کو نوٹس دیا کہ چونکہ قادیان میں آپ کے داخلہ پر حکومت نے پابندی عائد کر دی ہے لہٰذا آپ قادیان نہیں جا سکتے۔ شاہ جیؒ نے پولیس کا یہ نوٹس پھاڑ دیا۔ اور قادیان کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس موقع پر سینکڑوں احباب شاہ جیؒ کے ساتھ چل پڑے۔ آخر راستہ میں حضرت شاہ جیؒ کو گرفتار کر لیا گیا۔ شاہ جی کو اس مقدمہ میں تین ماہ قید کی سزا ہوئی۔ آپ کی مجموعی قید ۹ سال سے زائد بنتی ہے۔ لیکن جیل میں جا کر آپ کی شگفتہ مزاجی اور بھی نکھر جاتی تھی۔ آپ نے کوئی جائیداد نہ بنائی۔ اور تمام عمر ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہے۔ اور کرائے کے مکان سے ہی آپ کا جنازہ اٹھا۔ الحمد للہ آپ کے فرزندان گرامی نے بھی اپنی کوئی جائیداد نہیں بنائی۔ ۱۹۵۳ء میں شاہ جیؒ کو کراچی سے گرفتار کر کے سکھر سنٹرل جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس جیل میں حضرت شاہ جیؒ کو خوراک کے طور پر گلے ہوئے چاول اور مسور کی دال دی جاتی تھی۔ ڈیڑھ سال بعد جب

آپ جیل سے رہا ہوئے تو بیماری زور پکڑ چکی تھی اور آپ ذیابیطس کے مریض ہو چکے تھے۔
حضرت شاہ جی مرحوم و مغفور کے لاکھوں عقیدت مند آج بھی آپ کے جانشین پیر و مرشد حضرت مولانا سید ابومعاویہ ابوذر بخاری صاحب دامت برکاتہم کی قیادت میں آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے رواں دواں ہیں۔ حضرت شاہ جیؒ نے اپنے چاروں صاحبزادوں کو قرآن پاک کا حافظ قاری اور عالم بنایا۔ جانشین امیر شریعت وقت کے جید عالم اور عربی ادب و تاریخ کے ماہر ہیں۔ آپ تقریر و تحریر دونوں پر یکساں دست گاہ رکھتے ہیں۔ آپ کی تقریر میں شبنم کی پاکیزگی اور نشتر کی کاٹ ہوتی ہے آپ اپنی تقریر کو قرآن و حدیث اقوال صحابہ تاریخی حوالوں اور اشعار سے ایسا مزین کرتے ہیں کہ سننے والا مسحور و محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کا قرآن مجید پڑھنے کا انداز بھی حضرت امیر شریعتؒ کی طرح ہے۔ حضرت کے دوسرے فرزند حضرت مولانا سید عطاء المحسن شاہ صاحب بخاری، سید عطاء المومن بخاری صاحب اور سید عطاء المہیمن بخاری ہیں۔ مولانا سید عطاء المحسن بخاری صاحب بھی فن خطابت میں شاہ جی کا عکس جمیل ہیں۔ سید عطاء المہیمن بخاری کا شمار جید قراء میں ہوتا ہے۔ آپ صوفی کامل ہیں۔ آج کل آپ مدینہ منورہ میں مقیم ہیں۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ عظیم انسان تھے۔ اور بے شمار صفات کے مالک تھے۔ آپ نے اپنے سب سے بڑے فرزند حضرت مولانا سید ابومعاویہ ابوذر بخاری کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "مجھے پوری دنیا کے مسلمانوں کا فرنگی سے بڑھ کر اور اس سے بدتر کوئی دشمن نظر نہیں آیا۔ فرنگی یا اس کا کوئی دوست غلاف کعبہ کا لباس پہن کر اور آب زم زم سے وضو یا غسل کر کے بھی تمہارے سامنے آئے اگر تم میرے تخم سے ہو تو قیامت تک اس کا اعتبار نہ کرنا۔"
۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء بروز پیر بوقت عصر آپ اپنے خالق سے جا ملے۔ جنازہ میں دو لاکھ سے زائد افراد شریک تھے۔ آپ کے جانشین حضرت مولانا سید ابومعاویہ ابوذر بخاری صاحب دامت برکاتہم نے نماز جنازہ پڑھائی اور انسانی عظمتوں اور شرافتوں کا یہ پیکر باغ لانگے خاں ملتان کے مشہور قبرستان جلال باقری میں ابدی نیند سو گیا۔

اعتذار

• امیر شریعت نمبر کے لئے بہت سے احباب نے مضامین روانہ کئے بعض مضامین بہت دیر سے موصول ہوئے جنہیں آئندہ شمارہ میں شائع کیا جائے گا۔ آئندہ شمارہ حصہ دوم ہوگا۔!
موجودہ شمارہ تاخیر سے شائع ہوا ہے۔ ہم اس تاخیر پر معذرت خواہ ہیں۔ "ادارہ"

محمد فاضل خان
(کھڑک) آزاد کشمیر

اقلیمِ خطابت کا یکتا فرمانروا

خطیب الامت، بطلِ حریت، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ اقلیم خطابت کے یکتا فرمانروا تھے۔ ان کے جوشِ خطابت کے آگے پہاڑوں کے دل دہل جاتے تھے۔ وہ مردِ درویش جس کی للکار سے قصرِ برطانیہ پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ انہوں نے اللہ کی تائید و نصرت کے سہارے برصغیر کی تحریکِ آزادی میں وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ انگریز کی دو صد سالہ غلامی میں پسے ہوئے انسان بالخصوص مسلمان آزادی سے ہمکنار ہوئے۔

شاہ جی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مجلسِ احرارِ اسلام کے نام سے حریت پسند اور ایثار پیشہ رضا کاروں کی ایک مضبوط اور فعال عوامی جماعت تشکیل دے کر مرزا غلام قادیانی کی تحریک ارتداد و مرزائیت کو کچل کر رکھ دیا۔ مسلمان مرزائیت کے کفریہ جال میں پھنسنے سے بچ گئے اور اُن کا ایمان محفوظ ہو گیا۔ انہوں نے اپنی تقریروں سے نہ صرف انگریز کے خود کاشتہ پودے مرزائیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا بلکہ انگریزی تہذیب و ثقافت اور تعلیم کے خلاف بھرپور جہاد کیا۔

شاہ جی کی سیاسی زندگی کا آغاز جلیانوالہ باغ میں رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کرنے والوں پر تشدد آمیز واقعات سے ہوا جب انگریز نے برصغیر کے مسلم ہندو سکھ سب گولیوں سے چھلنی کر دیئے۔ پھر کیا تھا کہ وہ آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑے۔ حضرت شاہ جی نے چالیس سال تک برصغیر کے چپے چپے پر انسانوں کو قرآن کریم سنایا اور پرچمِ ختمِ نبوت لہراتے ہوئے ۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ کو اس فانی دنیا سے منہ موڑ گئے۔ سری نگر سے راس کماری اور خیبر سے چاٹگام تک ایک دوڑ لگائی، بیسیوں سیاسی و مذہبی تحریکات پروان چڑھائیں بدعات و رسومات بد کی بیخ کنی کی مسلمانوں میں جرأت و حوصلہ پیدا کیا۔

جب ریاست جموں و کشمیر کے مسلمانوں پر مہاراجہ سری سنگھ ظلم ڈھا رہا تھا تو شاہ جی اپنی جماعت مجلس

احرارِ اسلام کی قیادت کرتے ہوئے مسلمانوں کی آزادی کی خاطر مہاراجہ سے ٹکر لئے۔ اُس وقت شیخ عبداللہ مرحوم ہرزائی لابی سے ساز باز کرتے تو کشمیر ستمبر ۱۹۳۱ء ہی میں آزاد ہو جاتا۔ ریاست کے مسلمانوں کو رسوم و بدعات سے بچا کر تجارت کی ترغیب دی۔ پونچھ ریاست کے مسلمانوں کو آج سے غالباً ۶۰ سال قبل تین دن متواتر راولاکوٹ میں قرآن و حدیث کی روشنی میں وعظ و نصیحت کرتے رہے۔ حضرت شاہ جی کی تبلیغ پر مسلمانوں نے اپنی بچیوں کو شادی میں شرعی جہیز دینا شروع کیا ورنہ اُس سے قبل پونچھ ریاست کے مسلمان اپنی بچیوں کی شادی کے وقت لڑکے والے سے رقم طے کر کے ایک طرح کی قیمت وصول کرتے تھے حضرت شاہ جی کی دینی دعوت پر لوگوں نے اس رسمِ بد کو ترک کر دیا۔ میرے گاؤں کھڑک کے ایک بزرگ مولوی شیر دل خان مرحوم راوی تھے کہ "سید عطاء اللہ شاہ بخاری مسلسل تین دن راولاکوٹ میں وعظ و نصیحت کرتے رہے۔ ایک دن دورانِ تقریر کچھ لوگ چارپائی پر ایک مریض کو لیکر جلسہ گاہ میں آنکلے۔ مریض نے بلند آواز سے عرض کی حضرت بیمار ہوں۔ انگریز کا ملازم تھا لاعلاج ہو گیا ہوں۔ آپ سید ہیں۔ مجھے دم کریں۔ حضرت نے اپنے پاس بُلا لیا۔ دم کیا اور اُس شخص کی دائیں پاؤں کی ایڑی پھٹ گئی اور پیپ بہنا شروع ہو گئی۔ کچھ دیر بعد مریض ٹھیک ہو کر خود چل کر گھر گیا۔

آپ نے اپنی جماعت مجلس احرارِ اسلام میں ایسے جری اور جیالے کارکن پیدا کئے جنہوں نے اسلام کی سربلندی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ مسٹر جان گنتھر کے بقول "مجلس احرار اسلام مسلمانوں کی ایک ایسی حُریت پسند گولی تھی جس کا درد دنیائے اسلام کے لئے تھا۔ شاہ جی صرف خطیب یا واعظ ہی نہ تھے۔ بلکہ ایک عظیم مُدبر اور سیاست دان بھی تھے۔ اُن کی شخصیت کو صرف خطابت تک محدود رکھنا بہت بڑی بددیانتی ہے۔ آپ نے اپنے سیاسی تجربہ و مشاہدہ کی بنیاد پر جو پیشینگوئیاں کیں وہ آج کے حالات نے حرف بہ حرف صحیح ثابت کر دی ہیں۔

شاہ جی کا عظیم قافلہ ۱۹۵۳ء میں تحریک تحفظِ ختمِ نبوت میں کام آیا۔ حضرت شاہ صاحب کی رحلت کے بعد مفاد پرست گروہ نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا۔ البتہ مخلص کارکنوں کی ایک زبردست جماعت جانشینِ امیر شریعت حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہٗ کی قیادت و سیادت میں قیامِ حکومتِ الٰہیہ کی جدوجہد میں مصروف ہو گئی۔ جانشینِ امیر شریعت جرأت مند، متبحر ـــــ عالمِ دین اور بے مثل خطیب ہیں اپنے باپ کا عکسِ جمیل ہیں۔ شاہ جی کے دیگر فرزند سید عطاء المحسن بخاری، سید عطاء المومن بخاری اور سید عطاء المہیمن

بخاری اپنے آبا کی نشانی مجلس احرار اسلام زندہ رکھے ہوئے ہیں اور ہر آن تحفظ ختم نبوت کے میدان میں مرزائی ملعونوں کے مقابلہ میں کوہِ استقامت بن کر ڈٹے ہوئے ہیں سید عطاء المحسن بخاری نے ۱۹۷۶ء میں ربوہ میں مسلمانوں کی سب سے پہلی جامع مسجد احرار تعمیر کی اور ربوہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے ان کی امامت میں نمازِ جمعہ ادا کی ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے ۔ باپ فاتح قادیان بیٹا فاتح ربوہ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ جی کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے ——— آمین !

سید طلحہ میر گیلانی

چو کفر از کعبہ برخیزد ....

یہ نظم اُن چند فریب خوردہ رہنماؤں کے نام ہے جنھوں نے حصولِ اقتدار کی دُھن میں مسجدوں کو مقفل کر دیا ہے اور اسلامی آئین کی خاطر ۔ لادینوں اور دہریوں کو ساتھ لے کر نئے سفر پر نکلے ہیں ۔

صدائے دینِ احمد کچھ فقیہانِ حرم نکلے
لٹیرے اپنے گھر کے اپنے ہی اہلِ کرم نکلے

مقفل ہو گئی مسجد تلاشِ جاہ و منصب میں
ولی میں جن کو سمجھا تھا طلبگارِ ستم نکلے

نہیں پروا ہمیں کچھ سامراجی ناخداؤں کی
شہادت کی وہ منزل ہے جہاں تیغِ ستم نکلے

کبھی اس ملک میں ہم دہریت آنے نہیں دینگے
انہیں کہہ دو جو مُلّا لے کے ہیں اپنا دھرم نکلے

اُسی ساعت میرے اسلام کو ٹوٹا لیڈروں نے
کہ جس دم عابدوں کی آستینوں سے صنم نکلے

فریبِ دشمناں کھا کے جنہوں نے دیں کو چھوڑا تھا
پھر آیا وہ زمانہ اُن پہ ہی جورِ و ستم نکلے

چھپایا میر شرما کے انہوں نے منہ کو چادر میں
جو دیوانے رسول اللہ کا لے کر علم نکلے

اعلان

امیرِ شریعتؒ کی شخصیت پر مقابلہ مضمون نویسی کے لئے بہت سے مضامین موصول ہوئے ۔ آئندہ شمارہ میں انعامات حاصل کرنے والے قلم کاروں کے نام شائع کئے جائیں گے ۔ "ادارہ"

ش تیب
شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی

"مردِ آزاد الگ اپنا جہاں رکھتا تھا"

شاہ جی زندگی کے ہر شعبے کے لوگوں میں یکساں مقبول تھے۔ علماء، وکلاء، طلباء، صحافی، ادیب، شاعر، مدیر، امیر، غریب کوئی بھی تو ایسا نہ تھا جو شاہ جی کی عظمت کا معترف نہ ہو۔ آپ کو خراجِ تحسین پیش کرنے والے چند شعراء کا منتخب کلام ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

شورش کاشمیری :

خاکِ طیبہ کے مسافر کی دُعا یاد آئی
غائب از چشم بخاری کی صدا یاد آئی

جب کبھی اس کی خطابت کا تصوّر باندھا
قرنِ اوّل کے خطیبوں کی ادا یاد آئی

دُور تک جرأت گفتار کی بجلی کوندی
دیر تک شوخیٔ نقشِ کفِ پا یاد آئی

شورشؔ اس کشمکشِ دہر کے ویرانے میں
ایک محبوب قلندر کی ادا یاد آئی

بسمل سعیدی دہلوی :

باطل پسند ہونا تو بڑا سودمند تھا
وہ مردِ باخُدا تو مگر حق پسند تھا

اُس ساحرِ کلام کے ایک ایک لفظ میں
اک قلزمِ معانی ومفہوم بند تھا

دار و رَسن کے پنجۂ خونیں سے بے نیاز
محبوب اس کو سلسلۂ قید و بند تھا

ہم اور اس کی موت کے شایانِ شانِ غم
اس کا مقام و مرتبہ بسمل بلند تھا

حفیظ تائب :

لب پہ توحید کے نغمات رواں رہتے تھے
دل میں عشقِ شہِ لولاکؐ نہاں رکھتا تھا

کوئی خواہش نہیں رکھتا تھا بجز خدمتِ دیں
اِس تمنّا کو بہر حال جواں رکھتا تھا

روشِ اہلِ جہاں کا وہ نہیں تھا پابند
مردِ آزاد الگ اپنا جہاں رکھتا تھا

اس کے پاؤں میں نہ آئی کبھی لغزش تائبؔ
راہ میں گرچہ کئی سنگِ گراں رکھتا تھا

حبیب جالب :

ایک طرف توپوں کے دہانے ایک طرف تقدیر
زنداں میں بھی ساتھ رہی آزادی کی توقیر
خوشبو بن کر پھیلی تیرے خوابوں کی تعبیر
ٹوٹ گئی زنجیر

تجھ سے پہلے عام کہاں تھی دار و رسن کی بات
چاروں جانب چھائی ہوئی تھی محکومی کی رات
اپنے بھی تھے ظلم پہ مائل بیگانوں کے ساتھ
آگے بڑھ کر تو نے بدل دی ہم سب کی تقدیر
ٹوٹ گئی زنجیر

ارشد ملتانی :

جس کے لبوں پہ رقص کناں تھے علوم و فکر ۔۔۔ آتا ہے یاد فنِ خطابت کا شہریار
لرزاں تھا جس سے کفرِ سیاست قدم قدم ۔۔۔ وہ مردِ حق پرست وہ عالم وہ ذی وقار

عاصی کرنالی :

ذرا بلند ہوئی تھی وہ ایک موجِ صدا ۔۔۔ تمام اثاثۂ عہدِ فرنگ ڈوب گیا
جو فکرِ قوم نے پہنا عمل کا جامہ کبھی ۔۔۔ ہے اس میں عزمِ بخاری کا کارنامہ بھی
ہم سے خاک آلودگاں کو جسم و جاں دیتے رہے ۔۔۔ شاہ جی قریوں پہ جا جا کر اذاں دیتے رہے
خطۂ ارضِ وطن اک مشترک تعبیر ہے ۔۔۔ شاہ جی کا خونِ دل بھی شاملِ تعمیر ہے

اسلم انصاری :

اس کی آواز نے ظلمت کا جگر چاک کیا ۔۔۔ جبرِ افرنگ میں جرأت کا اجالا تھا وہ
عکسِ درس تھی اس حسنِ تکلم کی بہار ۔۔۔ آئینہ خانۂ کردار میں چہرہ تھا وہ

عابد صدیق :

جس کے بیاں سے لرزہ بجاں شوکتِ فرنگ ۔۔۔ جس کی زباں میں کوثر و تسنیم کا تھا رنگ

مردِ فقیر شاہ جی کہتے تھے جس کو لوگ
جس کو فقط غلامیٔ افرنگ کا تھا روگ

اس مردِ حر کا قوم نہ کیوں کرمنائے سوگ
پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

مسعود تابش :

بچھڑے ہوئے گو تجھ سے ہوا ایک زمانہ
سینوں میں کھلے ہیں تیری یادوں کے چمن زار

تو ختمِ رسالت کا مبلغ ہے وہ جس پر
اس ملک کے شاہد ہیں سبھی کوچہ و بازار

گلشن کی مہک تھی تیری ہستی کی عبارت
بلبل کی چہک تھی وہ تیری خوبیٔ گفتار

کی تُو نے سدا خرقۂ سالوس سے نفرت
درویش تھا رکھتا تھا شہنشاہ کے آثار

اُمید مُلتانی :

اے خودی کے پاسبان اے حریت کے تاجدار
اے متاعِ ملک وملت صاحبِ عزم ووقار

تیری جرأت سے ہوا ہے پرچمِ عدو کا سرنگوں
کر دیا تُو نے لباسِ کج کلاہی تار تار

انور جمال :

تقدیس کے لغت میں خدا کا ولی ہے تُو
دیباچۂ حیات میں حرفِ جلی ہے تُو

گفتار میں عرب کی بلاغت لئے ہوئے
کردار میں عجم کی جلالت لئے ہوئے

سوچوں میں سوز شمع خلافت لئے ہوئے
دھڑکن میں سازِ عشقِ رسالت لئے ہوئے

اک مردِ صد صفت کہ جماعت کہیں جسے
ایسا فقیر امیرِ شریعت کہیں جسے

میرا نسب یہی ہے یہی میرا نام ہے
جو غاشیِ رسول ہے، میرا امام ہے

ولی محمد واجد :

واللہ اُن کے قُرب کا لمحہ کبھی نہ دُوں
سارا جہاں بھی جو ملے مجھ کو مُول میں

اونچا علَم شریعتِ ختم الرسل کا ہو
معیار ہے اُسی کا ردّ و قبول میں

آؤ لگائیں دَر پہ بخاری کے ایک صدا
ممکن ہے کچھ کمی ہو شبِ غم کے طول میں

محمد شاہد شوکت
چونڈہ

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

حروف و الفاظ کے آئینے میں!

س :۔ ساجدِ خدائے واحد۔ ساحرِ زبان و بیان۔ ساقیِ مئے توحید و رسالتؐ، سالارِ قافلۂ حریت
سالکِ توحید، سائلِ دربارِ الٰہیہ، ستارۂ افلاکِ فصاحت و بلاغت، ستم رسیدۂ فرنگ،
ستیزہ گرِ خانہ سازِ نبوت، سخن فہم و سخن شناس و سخنور۔ سرمایۂ علم و عرفان، سکونِ دلِ پُر درد،
سیادتِ قافلۂ تحفظِ ختمِ نبوّت۔

ی :۔ یارِ علمائے حق، یادِ خیر القرون۔

د :۔ داورِ دلِ ناتواں، داعیِ قیامِ حکومتِ الٰہیہ، دافعِ نبوّتِ قادیان، دبیرِ مجلسِ احرارِ اسلام، دخیلِ
اوّل منقادیان، درسِ توحید، دیوانۂ قرآن و حدیثِ نبویؐ، دشمنِ فرنگ، دیباچۂ تحریکِ تحفظ ختمِ نبوّت
درویشِ حقیقی۔

ع :۔ عابد و زاہد، عارف باللہ، عالم باعمل، عتابِ خداوندی بر نبوّتِ بردزی، عترتِ رسولؐ، عتیقِ اسلام
عسکرِ ختمِ نبوّتؐ، عاشقِ حقیقی، عندلیبِ قرآن،

ط :۔ طالبِ حق، طلسمِ ہوش رُبا، طوفانِ الٰہی بر نبوّتِ کاذبہ۔

ا :۔ امیرِ شریعت، ابتذالِ ارتداد، احرارِ قفسِ فرنگ، احتشامِ اسلام، اتحادِ امت کا داعی،
اتباعِ محمدؐ کا نمونۂ کامل، اللہ کا عاجز اور مطیع و فرمانبردار بندہ۔ اسد اللہ

ش :۔ شہسوارِ خطابت، شاکرِ عطائے خداوندی، شاہینِ اسلام؛

شیر یزداں، شمشیرِ بے نیام، شائقِ دینِ متین، شہنشاہِ اقلیمِ سخن، شاگردِ رشید علامہ انور شاہ کاشمیریؒ

ا :۔ ارجمندِ سادات، احمریں خرمن کا دِلدادہ، احتسابِ مرزائیت کا بانی، ابرقِ قرطاسِ علم و عرفان۔

ا :۔ ہمدردِ انسانیت، ہم مشرب آزادؓ، ہم ذاتِ حسینؓ، ہمنوائے علمائے حق۔

ب :۔ برقِ الٰہی بر فتنۂ مرزائیت، باعلم و باعمل، بہی خواہِ مسلماں، بے مثل و بے مثال خطیب، بے غرض مبلّغ، بے لوث مجاہد۔

خ :۔ خادمِ اولیائے امتِ محمدی، خلوص و محبت کا پیکر، خلافتِ الٰہیہ کا طالب، خوش الحان، خوش اسلوب، خوش اطوار، خوش گلو، خوگرِ تلاوتِ قرآن، خیر اندیشِ انسانیت، خیر طلب۔

د :۔ ابرِ رحمت، آتش بیان، آدم خاکی، آشنائے معرفتِ الٰہیہ، آفتِ الٰہی بر نبوّتِ فرنگیہ، آلِ رسولؐ

ر :۔ رہنوردِ شوق، رحمتِ خداوندی، رطب اللسان، رگِ ظرافت کا حامل، رونقِ مجلس

ی :۔ یوسفِ حسنِ کلام، یادِ اُمتِ محمدیہؐ۔

بنامِ امینِ شریعت

ہزاروں آفتیں سنگِ مزاحم بن کے آتی ہیں
مگر مردانِ حق آگاہ کچھ پروا نہیں کرتے

وہ توپوں کے دہانوں پر بھی سچی بات کہتے ہیں
کبھی بھولے سے بھی انجام کو سوچا نہیں کرتے

مجید لاہوری مرحوم

مجرم و مُجرِم

انصاف کبھی یہ تھا کہ زنجیر ہلا دی
سلطان نے بنیک کی خوشی ہو کے صدا دی

لیکن ——— اِس دَور کا دستورِ چمن اور ہی کچھ ہے
کانٹوں نے کیا جرم تو پھولوں کو سزا دی

ابوالاسرار رمزی

قصّہ ایک خط کا

آخری قسط

(علامہ اقبال کے مرزائی بھتیجے کو دندان شکن جواب)

اس عقدہ کو بھی شیخ اعجاز نے خود ہی کھولا ہے کہ 'اقبال نامہ' میں تحریفات کی شانِ نزول کیا ہے، شیخ اعجاز لکھتے ہیں:

"جب صہبا صاحب نے شیخ محمد اشرف سے اس معمہ کی گرہ کشائی چاہی تو انہوں نے اپنے خطِ محررہ ۳ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں یہ جواب دیا۔

"مکاتیب اقبال کا ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا ہے دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں طبع ہوا تھا جس وقت یہ کتاب چھپ کر بازار میں آئی اس وقت چودھری محمد حسین جن کو آپ خوب جانتے ہوں گے زندہ تھے چودھری صاحب پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور پبلیکیشنز ڈویژن بھی تھے میرے ان سے تعلقات بھی تھے۔ علامہ اقبال مرحوم نے ایک خط سر راس مسعود کو تحریر کیا ہوا تھا جو بالکل درست تھا وہ خط بھی طبع شدہ ایڈیشن میں موجود تھا۔ چودھری صاحب پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ خط اس مجموعہ میں شامل ہو میں نے ہر چند ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس خط کو حذف نہ کیا جائے مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے مجبوراً وہ خط حذف کر دیا گیا۔ جو نسخے قبل ازیں فروخت ہو گئے ان میں وہ خط شامل ہوگا بقایا نسخے اس خط کے بغیر ہوں گے۔ یہ ہی فرق ہے جس کی طرف آپ نے نشان دہی کی ہے۔ اس خط کا عکس اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اصل خط شیخ عطاء اللہ صاحب مرحوم کے پاس موجود تھے۔ انہوں نے واپس نہیں کئے تھے۔ اب غالباً ان کے صاحب زادے مختار مسعود کے پاس موجود ہوں گے آپ نے صحیح تحریر فرمایا ہے بعض نسخوں میں صفحات بھی کم ہیں اور عبارتیں بھی مختلف ہیں۔

چونکہ ایک اہم اور طویل خط حذف کر دیا گیا تھا اس وجہ سے صفحات اور عبارت میں ضرور فرق ہونا لازمی تھا۔ امید ہے آپ کی الجھن دور ہو گئی ہو گی۔"[۳]

شیخ محمد اشرف کے صہیب لکھنوی کو اس جواب کے نقل کرنے کے بعد شیخ اعجاز نے اپنے چھوٹے بھائی شیخ مختار کو جو لاہور میں رہتے تھے یہ ساری صورت حال بتائی چنانچہ شیخ مختار نے شیخ اشرف سے ملاقات کر کے اپریل ۱۹۷۵ء کو اپنے بڑے بھائی شیخ اعجاز کو خط لکھا کہ:

"میں کل شیخ محمد اشرف صاحب سے ملا تھا وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اقبال کے حصہ اول کے بارے میں انہوں نے وہی بات بتائی جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس کتاب کی قریباً ۱۰ ہزار کاپیاں جب فروخت ہو گئیں تو چودھری محمد حسین صاحب نے چند خطوں کے بعض حصوں کو حذف کرنے کو کہا میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا، سب نے یہی کہا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ مجھے علم ہوا کہ چودھری صاحب چھ ماہ کے بعد ریٹائر ہو جائیں گے۔ چودھری صاحب اس لڑائی کے زمانہ میں پیپر کنٹرولر بھی تھے اور کاغذ کا کوٹہ بھی وہی دیتے تھے انہیں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ فیصلہ کیا کہ ابھی کتاب کی فروخت بند کر دی جائے اور کسی طرح چھ ماہ گزر جائیں ان کے ریٹائر ہونے کے بعد کتاب فروخت کریں گے۔ چودھری صاحب کو دو سال کی ایکسٹینشن مل گئی۔ میں مجبور ہو گیا۔ کتاب کی چار ہزار کاپیاں چھپی تھیں ان کاپیوں میں ورق تبدیل کرنے پڑے جس میں مجھے کافی نقصان ہوا۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس اب کوئی کاپی نہیں ورنہ میں آپ کو مایوس نہ کرتا۔"[۴]

شیخ اعجاز نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے سید نذیر نیازی سے بھی پوچھا جس پر سید نذیر نیازی نے بھی تسلیم کیا کہ

"بعض (خطوط) میں چودھری صاحب مرحوم نے مصلحتاً کچھ تبدیلیاں بھی کیں ان معنوں میں کہ جو عبارت پسند نہ آئی اسے قلم زد کر دیا۔"[۵]

شیخ اعجاز اس ساری بحث کے بعد خط میں تحریف کا سارا الزام چودھری محمد حسین پر دھرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس کی اشاعت میرے محترم شریک کار (ہم دونوں (یعنی چودھری محمد حسین اور

شیخ اعجاز (جاوید اور منیرہ کے گارڈین تھے) کی سیاست کو گوارا نہ ہوئی۔ اس سیاست بازی کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہیں"۔ ۶

شیخ اعجاز اور ڈاکٹر اخلاق اثر کے اقبال نامے میں چھپنے والے ۷ ارجون ۱۹۳۷ء کے خطوط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شیخ عطاء اللہ کے مجموعۂ خطوط کے اس اصل خط کی بھی نقل انہوں نے پنجاب پبلک لائبریری سے حاصل کرلی ہے جو چودھری محمد حسین کی تحریف سے بچ گیا تھا۔ تاہم ڈاکٹر اخلاق اثر کے اقبال نامے کا وہ فیصلہ اصل خط دیکھ کر ہی کر سکتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ اصل خط کس کے پاس ہے۔ پھر انہوں نے اصل خط کی فوٹو کاپی دینے کی استدعا کی ہے حالانکہ اس خط کی فوٹو کاپی اقبال اور ممنون حسن خان مصنف ڈاکٹر اخلاق اثر نامی کتاب میں ص ۱۵ پر موجود ہے۔ خود اقبال نامے مرتبہ ڈاکٹر اخلاق اثر میں بھی اس خط کا پورا متن شائع نہیں ہوا جب کہ علامہ اقبال نے اس خط میں یہ بھی وضاحت کردی تھی کہ خود قادیانی مسلمانوں کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں اس واسطے ان کے نزدیک یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ہم علامہ صاحب کے اس خط کا عکس اقبال اور ممنون حسن خان مصنف ڈاکٹر اخلاق اثر سے لے کر شائع کر رہے ہیں جس کے بعد ہم بھی چاہیں گے کہ شیخ اعجاز نے اس خط کے بارے میں جو یہ عذر تراشا ہے کہ شیخ مختار مسعود اور ممنون حسن خان نے ان کے استفسارات کے جوابات نہیں دیئے ورنہ

" اگر اس کتاب کی طباعت سے پہلے ان میں سے کوئی ایک فوٹو کاپی مل گئی تو صورت حال عرض کردی جائے گی"۔ ۷

اب شیخ صاحب فرمائیں کہ اس عکسی نقول کی اشاعت کے بعد وہ بیچ اس معاملہ کے کیا فرماتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ساری تان اس خط کی عدم دریافت پر توڑ دی ہے۔ اس خط میں چودھری محمد حسین نے کیوں تحریف کی، شیخ محمد اشرف کیوں ان سے کسی قدر دبے رہے اور شیخ عطاء اللہ اور شیخ مختار مسعود نے اس کے بارے میں کبھی کوئی وضاحت کیوں نہیں کی۔ ایسے جواب ہیں جو ان ہی متعلقہ افراد کے لواحقین یا احباب دے سکتے ہیں مگر یہ دلچسپ حقیقت سمجھ میں نہیں آتی کہ اس پردۂ زنگاری میں کون تھا جو چودھری محمد حسین کو یہ خط شائع نہ کرنے پر مجبور کر رہا تھا

اور شیخ محمد اشرف نے چودھری محمد حسین کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس خط کو اپنی اصل حیثیت میں پھر کبھی شائع کرنے یا اس کے بارے میں لکھنے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی۔ پھر شیخ اعجاز کا یہ الزام کہ اقبال کی طرف سے انہیں ملنے والے صالحیت کے سرٹیفکیٹ کے اخفا سے چودھری محمد حسین نے شیخ اعجاز سے کوئی سیاست کی بھی، ناقابلِ فہم ہے اس لئے کہ صالحیت کے اس سرٹیفکیٹ کو چھپانے کا چودھری صاحب کو کوئی فائدہ نہ تھا اس لئے کہ صالحیت کے سرٹیفکیٹ سے زیادہ خطرناک بات شیخ اعجاز کے قادیانی عقائد کے حوالے سے اس خط میں موجود تھی جو ان کی صالحیت کی خوشی سے زیادہ اذیت ناک ہے اور ان کی صالحیت ان کے عقیدے کے ظاہر ہونے کے بعد بے معنی ہو جاتی ہے۔ چودھری صاحب کو شیخ اعجاز کا عقیدہ سیاست کرتے وقت ان کی صالحیت اور گارڈین شپ کے لئے زیادہ مہلک ہتھیار کے طور پر ہاتھ آسکتا تھا مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔ لہٰذا چودھری صاحب پر شیخ اعجاز کا یہ الزام نارواہے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس خط کے بارے میں یہ سند کافی ہے کہ یہ خط سر راس مسعود کو لکھا گیا جو بھوپال میں اس وقت وزیرِ تعلیم تھے اور ممنون حسن خان ان کے سیکرٹری تھے۔ اس امر کا اعتراف خود مظلوم اقبال صـ۳۲۸ میں موجود ہے۔ تاہم یہ سوال قارئینِ اقبال کے لئے حل طلب ہے کہ علامہ اقبال کے خطوط میں کتر بیونت کا حق کیا اقبال نے ان کو دیا یا انہوں نے خود ہی اپنے مفادات یا اپنی صوابدید کے تحت کیا اور ان کی یہ مصلحتیں کیا تھیں۔ خود شیخ اعجاز نے مظلوم اقبال میں خاندانی اور ذاتی حوالے کے پردے میں خطوط اقبال کی کتر بیونت کیوں کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان خطوط میں بھی اقبال کی شخصیت کے نہایت اہم گوشے شیخ صاحب کی کرم فرمائی سے اوجھل رہ جائیں۔ چودھری صاحب نے شیخ اعجاز سے سیاست کی تھی تو شیخ اعجاز نے کیا اقبال سے سیاست کی ہے؟ لیجئے ہم اس موضوع پر کچھ کہنے سے پیشتر آپ کی خدمت میں ڈاکٹر اقبال کا یہ خط عکسی نقل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

بزمِ جہاں میں سب ہیں لیکن نہیں بخاری — عالم کو کر گیا ہے اندوہ گیں بخاری
پیدا نہ ہوگا کوئی ایسا خطیب دانش — ایوانِ خلد میں ہے محفل نشیں بخاری

۱۳ ھ ۸۱

لاہور
۱۰ جون ۱۹۳۷ء

ڈیئر مسعود - پرسوں میں نے تمہیں ایک خط لکھا تھا۔
امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جواب لکھتا ہوں۔

[illegible]

والسلام

محمد اقبال

یہ خط ہم نے نیچے نقل کر دیا ہے تاکہ اس کا مفہوم سمجھنے اور عبارت پڑھنے میں کسی کو کوئی دقت نہ ہو۔

لاہور

۱۰ر جون ۱۹۳۷ء

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے تمہیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات

لکھنا بھول گیا جواب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کئے تھے یہ Guardian
از روئے وصیت مقرر کئے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے نام ان کے
حسب ذیل ہیں:

۱۔ شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں مجھ کو ان کے
اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

۲۔ چودھری محمد حسین۔ ایم۔ اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ صول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی
میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔

۳۔ شیخ اعجاز احمد بی اے ایل ایل بی۔ سب جج دہلی

۴۔ عبدالغنی مرحوم۔ عبدالغنی بے چارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ
خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد
میرا بڑا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رُو سے قادیانی ہے۔ تم کو
معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس واسطے یہ امر شرعاً
مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا Guardian ہو سکتا ہے یا نہیں
اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا
ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض
نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے
والے گارڈین تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور
کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کرے۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں
امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ آیوڈیکس اس کے لئے بہت مفید ہے
یہ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے دوسری سیال صورت میں۔ مؤخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے

والسلام
محمد اقبال

اب اس خط کا قصہ سنیئے کہ تمام جگہ دوسرے سارے مضامین میں اس کی اشاعت میں

سر مو فرق نہیں مگر سر کہیں فرق ہے تو شیخ اعجاز احمد اور قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے ریمارکس ہیں۔ شیخ اعجاز کہتے ہیں کہ گارڈین شپ میں ان کے حریف چودھری محمد حسین نے سیاست کرتے ہوئے علامہ اقبال کی طرف سے ان کی صالحیت کے سرٹیفکیٹ کو دبانے کے لئے یہ تحریف کی حالانکہ شواہد یہ ہیں کہ چودھری محمد حسین نے اس تحریف کے ذریعے شیخ اعجاز احمد کی گارڈین شپ کو محفوظ کر دیا اور عبدالغنی مرحوم کی جگہ سر راس مسعود کو گارڈین شپ دینے کی اقبال کی خواہش ظاہر کی۔ ہم اقبال نامے کی دونوں عبارتوں کا عکس دے کر اس صورت حال کی وضاحت کرتے ہیں۔

اقبال نامہ ۳۸۶ حصۂ اول	اقبال نامہ ۳۸۶ حصۂ اول
(۲۲۹) ——— (۲۴) خط ۲	(۲۲۹) ——— (۲۴) خط نمبر ۱
۱۰ر جون ۱۹۳۷ء	۱۰ر جون ۱۹۳۷ء
ڈیئر مسعود	ڈیئر مسعود
پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جواب لکھتا ہوں۔	پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جو اب لکھتا ہوں۔
میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardians مقرر کئے تھے Guardian ازروئے وصیت مقرر کئے گئے تھے۔ جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔	میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کئے تھے Guardian ازروئے وصیت مقرر کئے گئے تھے۔ جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔
۱۔ شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے ۲) چودھری محمد حسین ایم۔اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور یہ بھی میرے قدیم دوست	۱۔ شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔ ۲) چودھری محمد حسین ایم۔اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور

ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔ (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے، ایل ایل بی سب جج دہلی ۴۔ عبدالغنی مرحوم

اقبال نامہ ۳۸۷ حصہ اوّل

عبدالغنی بے چارے کی بابت تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کر دوں۔ مجھے اُمید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہوگیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ IODEX اس کے لئے بہت مفید ہے ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے دوسری سیال صورت میں۔ مؤخرالذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے، ایل ایل بی سب جج دہلی (۴) عبدالغنی مرحوم

اقبال نامہ ۳۸۷ حصہ اوّل

عبدالغنی بے چارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیرالدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۳۔ شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے لیکن وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کر دوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہوگیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ IODEX اس کے لئے بہت مفید ہے ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے دوسری سیال صورت میں۔ مؤخرالذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔ والسلام محمد اقبال

خط نمبر ۱: اقبال نامہ کا وہ خط ہے جو چودھری محمد حسین کی قطع و برید سے قبل شائع ہوا۔

اس میں لکیر زدہ عبارت ملاحظہ ہو۔ اس میں مندرجہ ذیل باتیں واضح ہیں۔

۱۔ عبدالغنی مرحوم کی جگہ میاں امیرالدین سب رجسٹرار کو مقرر کرنے کا علامہ نے ارادہ ظاہر کیا۔

۲۔ شیخ اعجاز کی جگہ سر راس مسعود کو Guardian مقرر کرنا چاہا جب کہ تحریف کردہ خط نمبر ۲ میں

۱۔ عبدالغنی مرحوم کی جگہ میاں امیرالدین کے تقرر کا کوئی ذکر نہیں۔

۲۔ عبدالغنی کی جگہ سر راس مسعود کے تقرر کا مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔

۳۔ یوں شیخ اعجاز کی گارڈین شپ کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔

یعنی چودھری محمد حسین نے تو شیخ اعجاز سے سیاست نہیں کی بلکہ شیخ اعجاز کی گارڈین شپ محفوظ کرنے کے لئے اقبال کے خط کی عبارت کو بدل دیا اور شیخ اعجاز کے عقائد اور ان کی گارڈین شپ سے محرومی کی وجہ کو چھپا دیا ہے اور انہیں خط سے نکال کر شیخ اعجاز کی خدمت انجام دی۔ اس لئے شیخ اعجاز کو تو چودھری محمد حسین کا احسان مند ہونا چاہیئے حالانکہ وہ اُلٹا گلہ کر رہے ہیں کہ چودھری صاحب نے شیخ اعجاز کی متنازعہ شخصیت کو غیر متنازعہ بنا دیا۔ اس کی وجہ بچوں کی گارڈین شپ میں شیخ اعجاز کو شریک رکھنا بھی مطلوب ہو سکتا ہے کہ خاندان اقبال کے اس فرد کو کسی نہ کسی طرح گارڈین شپ میں باقی رکھا جائے تاہم نیک نیتی سے بھی کی گئی اس کتر بیونت کے اخلاقی جواز کی تفہیم نہیں ہوتی کہ جس چیز کو علامہ شرعاً مشتبہ سمجھتے تھے اس کو اس عبارت سے حذف کر کے مباح کرنے کی سعی کیوں کی گئی اور شیخ اعجاز کے لئے "یہ نرم گوشہ" کیوں کر پیدا کیا گیا۔ ذیل میں ہم اقبال اور بھوپال، از صہبا لکھنوی میں شائع کئے گئے اس خط کا عکس شائع کر رہے ہیں۔

" لاہور ـــ ۱۰/ جون ۱۹۳۶ء

ڈیئر مسعود ـــ پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardians مقرر کئے تھے۔ یہ از رو ئے وصیت مقرر کئے گئے تھے۔ جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔

نام ان کے حسب ذیل ہیں۔ (۱) شیخ طاہرالدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو تقریباً بیس سال

سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو اُن کے اخلاص پر مکمل اعتماد ہے۔

(۲) چوہدری محمد حسین، ایم، اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں، اور نہایت مخلص مسلمان۔

(۳) شیخ اعجاز احمد بی، اے، ایل۔ ایل بی۔ سب جج دہلی[1]

(۴) عبدالغنی مرحوم[2] عبدالغنی بے چارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خاں صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے، نہایت صالح آدمی ہے لیکن وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو — GUARDIAN مقرر کر دوں مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے GARDIANS تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجۂ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ اُمید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہو گا۔ کہتے ہیں کہ IODEX اس کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے، دوسری سیال صورت میں۔ موخرالذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام۔ محمد اقبال[3]"

راس مسعود نے اس خط کا فوراً جواب دیا۔ اُن کا یادگار اور تاریخی خط ملاحظہ ہو :۔

"بھوپال — ۱۴ جون ۱۹۳۶ء

نہایت پیارے اقبال — تمہارا خط مورخہ ۱۰ جون ابھی ۳ بجے میں نے بغور پڑھا۔ چوتھے گارڈین کی بابت میری رائے یہ ہے کہ چونکہ میں نہ لاہور میں رہتا ہوں اور نہ کوئی اُمید لاہور کے قریب رہنے کی ہے۔ تو مجھے مقرر نہ کرو۔ بلکہ کسی ایسے دوست کو جو کم سے کم پنجاب ہی میں مقیم ہوں۔ البتہ اپنی وصیت میں یہ ضرور لکھو کہ اگر گارڈین کو کسی معاملہ میں جہاں تک کہ منیرہ سلمہا اور جاوید سلمہٗ کی تعلیم کا تعلق ہے کوئی مالی دقت پیش آئے تو پہلے میں مطلع کیا جاؤں، کیونکہ جب تک کہ ان دونوں کی انشاء اللہ بائیس[22] برس کی عمر ہو جائے۔ میں ہر ممکن طریقہ سے مدد دینے کے لئے تیار ہوں۔ بشرطیکہ میں زندہ رہا۔ یہ خود ایک بڑی ذمہ داری میں اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں، جو مجھے تم سے ہے۔ یہ ضرور کرنا کہ میرے متعلق اس سلسلے میں جو الفاظ اپنے وصیت نامہ میں درج کرو، جو

کو رجسٹرار کے پاس محفوظ کر رہے ہو۔ ان کی ایک نقل میرے پاس ضرور بھیج دینا۔ اگر خدا نخواستہ ضرورت پیش آئی تو یقین رکھو کہ تمہارے ان دونوں بچوں کے لیئے ان کی تعلیم کے مسئلے میں۔ میں وہی کروں گا جو اپنی اولاد کے لیئے۔ یہ ضرور صلاح دیتا ہوں کہ جہاں تک جائیداد وغیرہ کا تعلق ہے اسکا انتظام اپنے سامنے ہی ایسا کر دو کہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔ شکر ہے خدا کا نادرہ اب ذرا بہتر ہے۔

میں ہوں تمہارا چاہنے والا۔ راس مسعود

اقبال اور بھوپال میں علامہ اقبال کے اس خط کی اشاعت کا عکس اور سر راس مسعود کی طرف سے اس کے جواب کی اشاعت کا عکس اس بات کو تو ظاہر کرتا ہے کہ یہ خط ہر لحاظ سے درست اور صحیح ہے کیونکہ ۱۰ جون ۳۷ء کو علامہ نے خط لکھا اور ۱۴ جون ۳۷ء کو راس مسعود نے خط کا جواب دیا اور لکھا کہ ۱۰ جون کا خط میں نے بغور پڑھا اب خط پر اعتراض بے معنی ہے تاہم اقبال اور بھوپال کے اس خط میں بھی شیخ اعجاز کے عقائد اور قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے ریمارکس حذف کر دیئے گئے ہیں۔ اب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رود جلد سوم میں جو اقتباس دیا ہے۔ اس کے بارے میں اقبال نامے کے مرتب ڈاکٹر اخلاق اثر نے ہمارے نام ایک خط میں وضاحت کی کہ وہ بھی مکمل نہیں ہے کیونکہ خود اقبال نامے کی کتابت میں سے یہ عبارت رہ گئی۔

"کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے"۔[۱۴]

ڈاکٹر اخلاق اثر نے اس میں بتایا ہے کہ اصل میں اقبال نامے کا جو نسخہ ڈاکٹر جاوید اقبال کو دیا گیا اس میں یہ عبارت موجود نہ تھی۔ ملاحظہ کیجئے ڈاکٹر اخلاق اثر کے خط کا عکس:

Dr. AKHLAQ ASAR
M.A. (URDU), M.A. (ENGLISH), Ph.D
Vice President
All India Urdu Writers & Journalist Forum
For National Integration (Registered)

SADIQ MANZIL
Chowki Imambara
BHOPAL - 462 001

Dated 7-1-86

محترم وحید عشرت صاحب! وعلیکم السلام

زندہ رود (تینوں جلدیں) اور اقبال اور حیدرآباد موصول ہوئیں۔ بہت بہت شکریہ۔ آپکی حسب فرمائش اپنی تالیفات "اقبال اور شیشی محل"، "اقبال نامے" اور تصنیف "اقبال اور مجنوں" رجسٹری سے روانہ کر رہا ہوں۔ "اقبال نامے" کا دوسرا ایڈیشن اور "اقبال کا وظیفہ" اپریل تک مکمل ہونے کی امید ہے۔ "مظلوم اقبال" اور

دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ اقبال کے اقتصادی اور معاشی حالات پر معلومات مکمل ہو جائیں۔
اگر ممکن ہو تو یہ زحمت اور برداشت فرمائیں۔ میری تالیفات کے بارے میں آپ کی نیک
خواہشات میرے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔

"مطالعۂ اقبال" پر آپ کا تبصرہ پڑھ لیا تھا۔ اُس میں اقبال کے ۱۰ رجون ۱۹۳۷ء
کے مکتوب کا حوالہ تھا جو آپ نے "زندہ رود" سے لیا تھا۔ اس وقت تک میں نے "زندہ
رود" نہیں دیکھی تھی اور یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اقتباس "اقبال نامہ" سے لیا گیا ہے۔
اس مکتوب کا مکمل متن "اقبال اور ممنون" صفحہ ۱۵ پر فوٹو کاپی کی شکل میں دیا گیا ہے۔
"زندہ رود" میں اس مکتوب کا اہم حصہ رہ گیا جو بعد کے نسخوں میں ہاتھ سے بڑھا دیا گیا تھا اور
یہ تحریر اس نسخہ میں بڑھائی نہ جا سکی تھی جو جناب جاوید اقبال صاحب کی خدمت میں بھیجی
گئی تھی۔ کتابت کی غلطی بہت بعد میں نظر آئی۔ وہ اہم حصہ یہ ہے:
"یہ کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔
اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے۔"
امید ہے کہ ۱۰ رجون ۳۷ء کے مکتوب کی فوٹو کاپی سے آپ کی ضرورت پوری ہو جائے
گی۔ دیگر مکاتیب کے علاوہ یہ مکتوب بھی مجھے جناب ممنون حسن خاں صاحب سے موصول
ہوا تھا۔ جس کی تفصیل "اقبال نامے" میں دی ہوئی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے جناب رفیع الدین
ہاشمی صاحب اس مکتوب اقبال کی فوٹو کاپی شیخ اعجاز احمد صاحب کو ارسال کر چکے ہیں۔
میری جن تصانیف یا تالیفات کے حقوق اشاعت کی ضرورت سمجھیں تو تحریر فرمائیں
اور رائلٹی کی شرائط کی تفصیلات بھی لکھیں تاکہ میں اپنے ... سکوں۔ اجازت ملے کہ کوئی
کار روائی کروں۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ تعاون کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔ آپکا

اخلاق اثر

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب سے ہم نے استفسار کیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے اس مکتوب کی فوٹو کاپی نہیں ملی، اور نہ میں نے شیخ اعجاز کو کوئی کاپی ارسال کی ہے۔ ڈاکٹر اخلاق اثر نے اپنے اس خط میں ان احوال کی وضاحت کر دی ہے کہ کیونکر یہ عبارت مکمل طور پر زندہ رود جلد سوم میں نہیں آسکی۔

اب ایک اور محکم شہادت جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال اور منیرہ بیگم کی آیا محترمہ ڈورس احمد نے اپنی حالیہ انگریزی کتاب "اقبال جیسا کہ میں جانتی ہوں" میں فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علامہ اقبال، شیخ اعجاز احمد کو بہت عزیز رکھتے تھے مگر علامہ ان کے قادیانی ہو جانے کی وجہ سے ان سے سخت نالاں تھے۔ اور وہ اپنے بچوں کے سرپرستوں میں سے بھی انہیں نکال کر کسی اور متبادل کی تلاش میں تھے، چنانچہ علامہ نے ان سے متعدد بار اپنے اس کرب کا اظہار کیا اور شیخ اعجاز احمد کے قادیانی ہو جانے کے عمل کو ہمیشہ اور مکمل طور پر ناپسند کیا ہے۔

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اس خط میں تحریف کوئی نادانستہ طور پر کسی ایک فرد نے نہیں کی۔ بلکہ کسی خاص فرد اور جماعت کی طرف سے ایک خاص منصوبہ بندی اور کوشش سے مختلف اشخاص سے اپنے اثر و نفوذ کی بنیاد پر تحریف کروائی گئی ہے۔ اور اس کا مقصد شیخ اعجاز ان کے عقیدے اور قادیانیوں کے بارے میں علامہ اقبال کے واضح اور صریح اظہار و مؤقف کو چھپانے کی سعی نامسعود کی گئی ہے۔ تاہم مختلف خطوط میں مختلف عبارات نے اس سراسر جھوٹ کو بے نقاب کر دیا ہے ہماری طرف سے اس تازہ خط اور اس کی عکسی نقل کی اشاعت کے بعد چند باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ علامہ اقبال کے جملہ خطوط کی چھان بین کی جائے۔

۲۔ تحریفات اور خطوں کی عبارت کی قطع و برید کو ختم کیا جائے اور علامہ کے خط ان کی اصل حالت میں شائع کئے جائیں۔

۳۔ ذاتی اور خانگی حالات کی آڑ میں علامہ کے خطوط کی تصحیح یا قطع و برید نہ کی جائے اس لیے کہ علامہ اقبال کے خانگی حالات پر بہت کچھ سامنے آ چکا ہے۔ موجودہ صورت میں قطع و برید غلط فہمیوں کو جنم دے گی۔

۴۔ علامہ کے خطوط کی عکسی نقول بھی شائع کی جائیں۔

۵۔ علامہ کے اصل خطوط اقبال میوزیم میں یا کسی اور محفوظ مقام پر اپنی اصل حالت میں محفوظ رکھنے کا بندوبست کیا جائے۔

۶۔ تمام اردو اور انگریزی خطوط کو ایک کلیات مکاتیب اقبال میں عکسی نقول کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔

۷۔ خطوط کے بارے میں معلومات، مکتوب الیہ، خطوط کا زمانہ، تحریر، وجہ تحریر، مقام تحریر وغیرہ ہم واضح طور پر دی جائیں۔

۸۔ مختلف خطوط کے مجموعوں کے تقابلی مطالعہ سے خطوط کی اصل عبارت کا تعین کیا جائے۔

۹۔ تمام مکتوبات کی مائیکرو فلمیں بنائی جائیں۔

اس طریق کار سے علامہ اقبال کے خطوط محفوظ ہو سکیں گے اور تحقیق کاروں کو اصل متن

اور ان کے مفہوم تک پہنچنے میں سہولت ہوگی ۔ اور بہت سے سیاسی ، اخلاقی ، ادبی ، علمی اور تاریخی حقائق تک اقبال کی اپروچ سے آگاہی ہوسکے گی ۔

حوالہ جات

۱۔	جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال	زندہ رود جلد سوم	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	
۲۔	شیخ اعجاز احمد	مظلوم اقبال	جی ۲۱۳ داؤد پورٹ روڈ کراچی ۴	ص ۳۴۴
۳۔	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۴۴، ۳۴۵
۴۔	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۴۵، ۳۴۶
۵۔	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۴۶
۶۔	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۴۷
۷۔	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۴۸
۸۔	ڈاکٹر اخلاق اثر	اقبال اور ممنون حسن	دارالاقبال بھوپال	ص 15
۹۔	شیخ عطاء اللہ	اقبال نامہ	شیخ محمد اشرف لاہور	ص ۳۸۶، ۳۸۷
۱۰۔	صہبا لکھنوی	اقبال اور بھوپال	اقبال اکادمی کراچی حال لاہور	ص ۲۴۵
۱۱۔	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۲۴۵

۱۲-۱۳۔ ڈاکٹر اخلاق اثر کا ڈاکٹر وحید عشرت کے نام خط ۔

۱۴۔ ڈورس احمد ، اقبال ، جیسا کہ میں جانتی ہوں (انگریزی) اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۸۶ء، ص ۴۳

حرفِ آخر

مَنْ ارْتَدَّ فَاقْتُلُوْهُ

جو مُرتد ہو جائے اُسے قتل کردو !

اِرشادِ رسولِ کریم علیہ التحیۃ والتسلیم

مُطالبہ

مُرتد کی شرعی سزا نافذ کرو (تحریک تحفظ ختم نبوت پاکستان)

افکارِ احرار

درسِ عبرت

" حق کی بات کہنے سے کبھی گریز نہ کرو خواہ تمہارے سر پر تلوار ہی کیوں نہ لٹک رہی ہو، کیا تم موت سے ڈرتے ہو، حالانکہ ربِّ کائنات نے موت کا ایک دن اور ایک وقت مقرر کر دیا ہے، پھر موت سے ڈر کر سچی بات کہنے میں ہچکچاہٹ اختیار کرنا انتہائی بزدلی ہے اور ایمان کی کمزوری ہے۔ کمزور اور بزدل قوم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ زمین کی پیٹھ کا بوجھ بن کر زندہ رہے، کمزوری اور ضعیف ایمان ایسا گھُن ہے جو اندر ہی اندر قوم کو کھا جاتا ہے۔ مشکلات کے راستے سے ڈر کر اللہ کے راستے سے فرار اختیار کرنا بغاوت ہے اور باغی کی سزا تم جانتے ہی ہو، کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا حشر بھی وہی ہو جو تم سے پہلی قوموں کا ہوا ہے، کیا کھنڈروں میں ڈھلی ہوئی بستیاں جو قہرِ خداوندی کا نشانہ بنیں اور صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئیں، تمہاری عبرت کے لئے کم ہیں؟ جہاد ایمان کی روح ہے اور مجاہد دین کا ستون، جہاد سے انکار کفر ہے اور کفر ظلمتِ قلب، دل سیاہ ہو تو انسان انسانیت کے دائرے سے نکل جاتا ہے، دل کی بستی تاریک ہو تو انسان خدا کو بھول کر عیش و عشرت میں کھو جاتا ہے، دل ہی ظلمت نگر ہو تو تیغ و سناں جو انسان کے زیور ہیں، ان کی جگہ طاؤس و رباب لے لیتے ہیں۔ جب قومیں طاؤس و رباب کی رسیا ہو جاتی ہیں تو مٹ جاتی ہیں اور ان کی تباہی دوسروں کے لئے عبرت کا درس بن جاتی ہے۔"

بانیٔ احرار امیرِ شریعت
سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

آئیے۔ اللہ کی رضا اور اجر حاصل کیجئے!

ہمارے دینی ادارے اور مستقبل کے منصوبے

مسلمان توجہ فرمائیں

★ — مجلسِ احرارِ اسلام دینی انقلاب کی داعی ہے۔ دینی انقلاب — دینی مزاج اور دینی ماحول پیدا کیے بغیر ممکن نہیں۔ ۱۹۲۹ء سے آج تک احرار نے بیسیوں تحریکوں کو جنم دیا اور پروان چڑھایا۔ احرار کی سب سے بڑی، مضبوط اور زندہ تحریک **تحریکِ ختمِ نبوّت** ہے۔

★ — پاکستان سے پہلے اور پاکستان کے بعد احرار نے سینکڑوں دینی ادارے قائم کیے جن سے اُمّتِ مسلمہ میں دینی مزاج عام اور دینی قوتوں میں اضافہ ہوا۔ اکابرِ احرار نے ایک بات شدّت سے محسوس کی کہ جب تک دینی ادارے بُنیادی طور پر احرار کی نگرانی میں نہیں چلتے اُس وقت تک یکجہتی پیدا ہونا مشکل امر ہے۔ لہٰذا ہم نے اُمّتِ مسلمہ کے تعاون سے اندرون و بیرونِ مُلک دینی ادارے قائم کئے ہوئے ہیں جن کی مختصر تفصیل یُوں ہے:

★ مدرسہ معمورہ — مسجدِ نور، تغلق روڈ ملتان

★ مدرسہ معمورہ — دارِ بنی ہاشم، پولیس لائنز روڈ ملتان

★ مدرسہ محمودیہ معمورہ — ناگڑیاں ضلع گجرات

★ جامعہ ختمِ نبوّت — مسجد احرار متّصل ڈگری کالج ربوہ — فون نمبر: ۸۸۶

★ مدرسہ ختمِ نبوّت — سرگودھا روڈ ربوہ

★ دارالعلوم ختمِ نبوّت — چیچہ وطنی فون نمبر: ۲۹۵۳

★ مدرسہ ابوبکر صدّیق — تلہ گنگ ضلع چکوال

★ یُوکے ختمِ نبوّت مشن — (ہیڈ آفس) گلاسگو، برطانیہ

یہ ادارے سرگرمِ عمل ہیں۔ ان کے اخراجات اور آئندہ کے منصوبے، مسجد احرار ملتان، مدرسہ معمورہ کے بڑھتے ہوئے کام کے پیشِ نظر زمین کی خرید اور تعمیرِ نو، دفاتر کا قیام، بیرونی ممالک میں مُبلّغین کی تعیناتی اور اداروں کا قیام، پچاس کتابوں کی اشاعت — یہ تمام کام اُمّتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تعاون سے ہوگا۔ یہ کام آپ ہی نے کرنا ہے۔

تعاون آپ کریں دُعاء ہم کرینگے اور اجر اللہ پاک دینگے — آئیے، آگے بڑھئے اور اجر کمائیے

فقیر سیّد عطاء المحسن بخاری
مُدیر مدارس التحفیظ والمساجد
دارِ بنی ہاشم ○ پولیس لائنز روڈ ○ ملتان
ترسیلِ زر کے لئے: اکاؤنٹ نمبر: ۲۹۹۳۲ حبیب بینک لمیٹڈ حسین آگاہی ملتان